اطلاعات کتاب و تبصرہ از مولانا محمّد عباس و پی ڈی اف سازی از حیدرعبّاس رضا سلمّہ فرزند مولانا

اسم کتاب: زینت کربلا

مولف: سید آغا اشہر لکھنوی

زبان: اردو **صفحات:** ۱۹۲

موضوع: تاریخ، سیرت، کربلائیات، حضرت زینب

ناشر: عزیز ہند پریس جھانسی، زیر نگرانی سید آغا ہادی لکھنوی، پرنٹر محمد عمر کاتب فتحپوری، 1944 عیسوی

توضیح و تبصرہ :
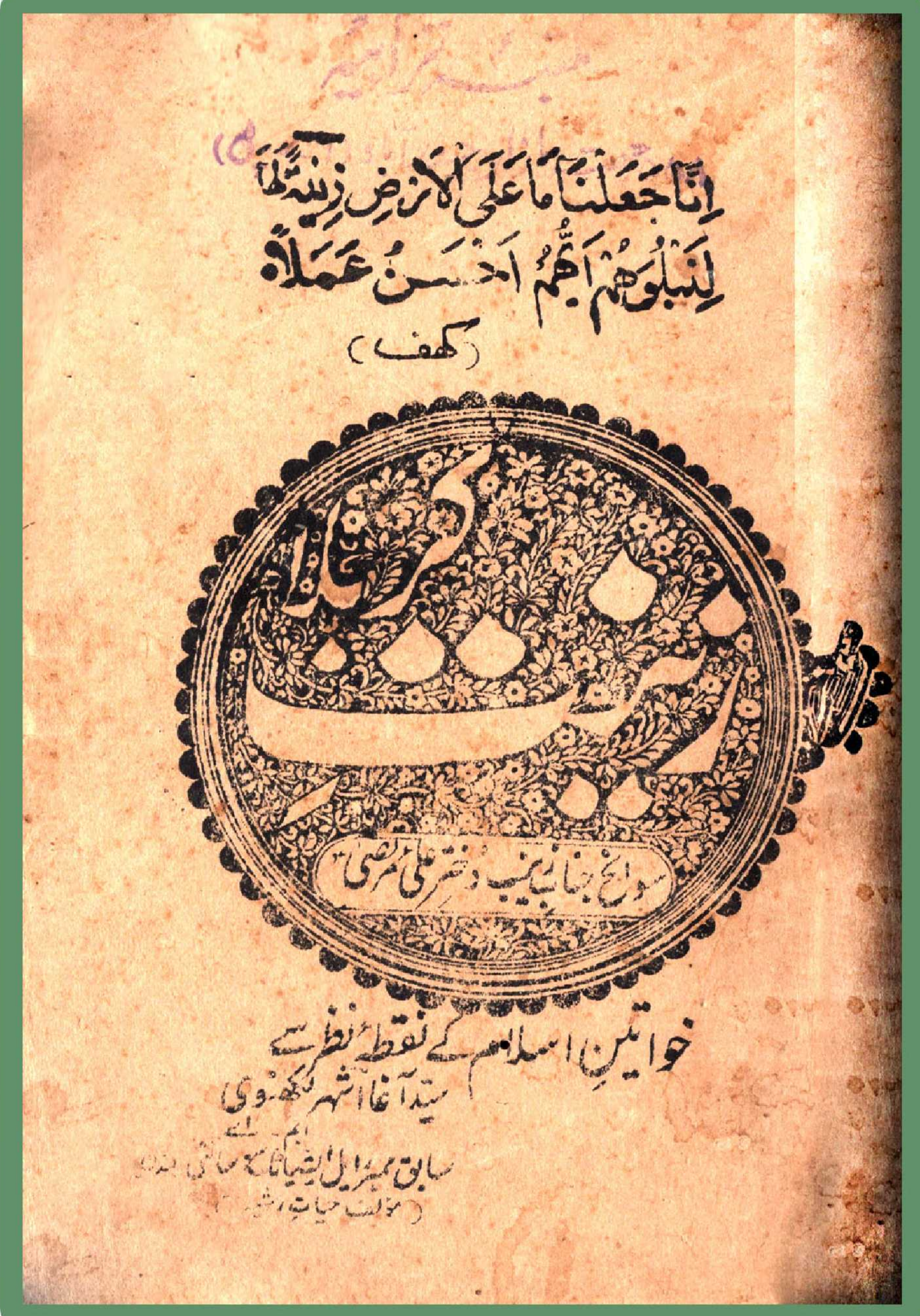
خواتین کیلئے تاریخ اسلام کی آفاقی شخصیات کا مطالعہ ضروری ہے اس لیے کہ تاریخ ماضی کا آئینہ اور ہر دور کیلئے ایک روشن چراغ ہے ۔تاریخ کی انہی آفاقی شخصیات میں عالم اسلام کی نامور ہستی اور تاریخ کربلا کی رکن رکین حضرت زینب کی سیرت طیبہ ہے اور حضرت زینب کی سیرت کا مطالعہ ہر عورت، خصوصا مسلمان عورت کیلئے لازمی ہے۔لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ اردو زبان میں اس باعظمت بی بی پر بہت کم لکھا گیا ہے۔اسی کمی کو پورا کرنے کی غرض سے مشہور شاعر، ادیب اور تاریخ داں جناب سید آغا اشہر لکھنوی نے سالہا سال کوششوں کے بعد جناب زینب کبری کی سوانح حیات پر "زینت کربلا" نامی شاندار کتاب لکھی ۔آپ کو تاریخی کتابیں لکھنے پر خاص مہارت حاصل ہے اسی لیے نواب نصیر حسین خیال نے آپ کے بارے میں فرمایا تھا کہ "اشہر کو سوانح لکھنے کا ڈھب یاد ہے"اس سے پہلے آنے "حیات رشید "نامی کتاب لکھی جو کافی مشہور ہوئی آپ ایک اور مشہور کتاب "تذکرۃ الذاکرین" بھی ہے ۔جس وقت آپ نے زینت کربلا لکھنے کا آغاز کیا اس وقت تک اردو زبان میں اس موضوع پر بس ایک دو کتابیں موجود تھیں اسی لیے مصنف نے اس عنوان پر قلم اٹھانے کی ٹھانی اور اس سلسلہ میں جناب عزیز لکھنوی اور مولانا ناصر حسین سے مشورے لیے اور اس کتاب کی تکمیل میں مولانا سید محمد نواب سے مدد لی اور جب کتاب مکمل کرلی تو اسے مولانا سید محمد سعید عبقاتی صاحب کو دکھایا اور آپ کی اس کتاب پر اس دور کے جید علماء نے تقریظیں لکھی ہیں میں انہی تقاریظ کی روشنی میں اس کتاب کی چند خصوصیات لکھ رہا ہوں تاکہ آپ میں اس کتاب کے مطالعہ کا شوق پیدا ہو۔زینت کربلا ایک جامع اور دلچسپ کتاب ہے جو 1944 عیسوی میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی اس کتاب کی نمایاں خصوصیات یہ ہیں کہ یہ کتاب صرف جناب زینب کی سیرت کی کتاب نہیں بلکہ نصف نسواں کیلئے بہترین اخلاقی دستور العمل اور زبان و ادب کے لحاظ سے ایک ادبی شاہکار بھی ہے ۔اس کتاب میں واقعات کو ترتیب و تسلسل کے ساتھ بیان کیا گیا ۔معتبر حوالے دیے گئے ۔صرف چند ناگزیر عربی فقرات اور اشعار کے علاوہ عربی عبارتوں کے ذکر سے گریز کیا گیا اورصرف ترجمہ پر اکتفا کیا گیا ہے ۔اس کتاب کی زبان اتنی سادہ ، سلیس اور روان ہے کہ جسے ارباب علم و فہم ہی نہیں بلکہ اوسط درجہ کی تعلیم یافتہ خواتین وحضرات بھی پڑھ سکتے ہیں۔اس کتاب میں ایک باب "مرثیہ اور حضرت زینب" کے عنوان سے ہے جس پتہ چلتا ہے کہ مصنف نے میر انیس کے کلام کا کس دقت نظر سے مطالعہ فرمایا ہے۔

إِنَّا جَعَلْنَا مَا عَلَى الْأَرْضِ زِينَةً لَّهَا
لِنَبْلُوَهُمْ أَيُّهُمْ أَحْسَنُ عَمَلًا

(کہف)

سوانح جناب زینب دختر علی مرتضیٰ

خواتینِ اسلام کے نقطۂ نظر سے

سید آغا اشہر لکھنوی
ایم اے
سابق ممبر رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن
(مؤلف حیات اشہر)

کتاب کے ترتیبی عنوانات

کتاب کے متعلق چند ارشادات

(۱) عالی جناب حضرت مولانا سید محمد سعید صاحب قبلہ باسمہ سبحانہ

قرۃ عین النبوۃ فلذۃ کبد الامامۃ۔ مخدرۂ عصمت و طہارت رب علیا مکرمہ حضرتِ زینب صلوٰۃ اللہ و سلامہٗ علیہا کربلا و مابعدِ کربلا کے حسینی معرکے میں ایک رکنِ رکین و جزوِ اہم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اسی لیے امام علیہ السلام نے باوجود اعزا و اقارب کی عام مخالفت رائے کے اُن کو سفرِ غربت میں اپنے ہمراہ رکھنا رکھنا ہی ضروری خیال فرمایا۔ چنانچہ حسینی مقصد کے کامیاب بنانے میں جو کچھ اس شخصیتِ عظمیٰ سے ظہور میں آیا' اُس نے دُنیا سے منوا لیا کہ انسانیت کے اس رہبرِ اعظم کی قوتِ نظر اور اصابتِ رائے کتنی بلند اور دور رس تھی۔

انھیں خاتونِ عصمت کے دردناک اور سبق آموز حالاتِ زندگی کے متعلق جناب سید آغا اشہر صاحب لکھنوی دامت معالیہٗ نے

یہ کتاب تالیف فرمائی ہے، جس کے چند مقامات جو جنابِ مؤلف نے منتخب فرمائے نظرِ قاصر سے گزرے، جس سے آپ کا اندازہ ہوا کہ موصوف کی قلمی کاوش نے نہ صرف ایک اہم ضرورت کو پورا کیا ہے بلکہ اُردو داں اصحاب کے لیے ایک قابلِ قدر تحفہ پیش فرمایا ہے۔

اس کتاب میں آپ نے علمی و ادبی افادات کو کافی دلچسپ بنانے کی کوشش کی ہے، چنانچہ وہ مقام بغور نظر کرنے کے قابل ہے جہاں آپ نے عہدِ جاہلیت کی ایک شاعرہ زینب بنت الطثریہ اور حضرتِ علیا مکرمہ سلام اللہ علیہا کے مرثیوں میں موازنہ کرتے ہوئے عقائدِ دینیہ کی روشنی میں بہت اچھا نتیجہ نکالا ہے۔ اسی طرح وہ مقام بھی دلچسپ ہے جہاں آپ نے بنی ہاشم کے جود و کرم پر شعراءِ عرب و عجم کے کلام سے استدلال کیا ہے۔

روایاتِ انتقال پر روشنی ڈالتے ہوئے جو مسلک آپ نے اختیار کیا ہے اُس سے واضح ہوتا ہے کہ اس باب میں آپ کی نظر سطحی نہیں بلکہ عمیق ہے۔

حضرت مخدرۂ عصمت سلام اللہ علیہا کی پاکیزہ زندگی

سے تہذیبِ نفس اور تدبیرِ منزل کے جو اصول آپ نے واضح فرمائے ہیں وہ طبقۂ نسواں کے لیے بے شبہہ ایک زرین دستورالعمل پیش کرتے ہیں۔

الحاصل ہر طرح اس کتاب کو دلچسپ اور سبق آموز بنانے کی کوشش کی گئی ہے جس سے امید ہے کہ یہ کتاب مؤمنین میں خاطر خواہ مقبول ہوگی۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُضِیْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِیْنَ ٥

حررہٗ بیناہ الوازرہ

محمد سعید الموسوی العبقاتی عفی عنہ بقلمہ

۷ شوال المکرم ۱۳۶۶ھ

کتب خانۂ ناصریہ کھجوہ لکھنؤ

(۲) فاضلِ علومِ مشرقیہ عالی جناب مولانا سید محمد حسین صاحب عرف محمد نواب صاحب (استاد لکھنؤ یونیورسٹی)

"زینتِ کربلا" کو میں نے پڑھا۔ جنابِ مصنف نے جو موضوع اختیار کیا ہے وہ دینی اور دنیوی دونوں پہلوؤں سے نہایت موزوں ہے۔ جزاہ اللہ۔ اس کتاب میں جسقدر

تاریخی حوالے ہیں اُن کے ماخذ بھی لکھ دیے گئے ہیں۔ اور ادبی لحاظ سے تو میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ اُردو ادب میں ایک گراں بہا اضافہ ہے۔ یہ کتاب اس طرز سے لکھی گئی ہے کہ نہ صرف اربابِ علم اسے پڑھ کر محظوظ ہوں، بلکہ خواتینِ اسلام نیز اوسط درجے کی قابلیت رکھنے والے حضرات بھی اس کے مطالعے سے بہت فائدہ حاصل کر سکتے ہیں۔ حضرتِ زینبؑ کے کردار کو نہایت مسلسل طریقے سے جنابِ اشہر نے واضح فرما دیا ہے۔ حتی الامکان عربی ماخذ کی عبارات کو نظر انداز کر کے ترجمے سے کام لیا ہے، جو نہایت دلچسپ ہے۔ لیکن جہاں اشعار یا ضروری فقرات عربی کا لکھنا ناگزیر تھا اُن کو بعینہٖ مع ترجمے کے نہایت برمحل اور برجستہ استعمال کیا ہے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ جنابِ اشہر کو منجانب اللہ الہام ہوا ہے، جو یہ موضوع اختیار کیا ہے۔ اور زبانِ اُردو کا تو کیا کہنا، جو لکھنؤ کی ٹکسالی ہے۔

حضرتِ زینبؑ کے متعلق جہاں تک مجھے علم ہے اس سے زیادہ تحقیق و تدقیق اور معتبر ماخذوں سے کسی مؤلف نے کام نہیں لیا۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب خاطر خواہ مقبول ہوگی۔

حررہٗ سید محمد حسین ۲۴ جولائی ۱۹۴۷ء (شاہ نذر منزل لکھنؤ)

(۳) عالی جناب پروفیسر سید مسعود حسن صاحب رضوی ادیبؔ
صدر شعبۂ فارسی و اُردو (لکھنؤ یونیورسٹی)

جناب آغا اشہر لکھنوی، جو "حیاتِ رشید" کے مصنف کی حیثیت سے شہرت رکھتے ہیں، ایک مدت سے ثانیِٔ زہراؑ حضرتِ زینبؑ کے سوانح کی تدوین میں مصروف تھے۔ اُن کی سالہا سال کی مسلسل کوششوں کا نتیجہ "زینتِ کربلاؑ" کے نام سے عنقریب منظرِ عام پر آنے والا ہے۔ فاضل مصنف نے کتاب کی اشاعت سے پہلے اُس کے مختلف مقامات پڑھ کر مجھے سُنائے۔ میں اُن کی اس عنایت کا شکر گزار ہوں۔ موصوف نے کتاب کو جامع اور دلچسپ بنانے میں حتی المقدور کوئی کمی نہیں کی۔ حالات کی تحقیق، واقعات کی ترتیب، زبان کا لطف، بیان کا حُسن غرضکہ جو خصوصیتیں کسی تالیف کی کامیابی کے لیے ضروری ہیں اُن سب کو اس کتاب میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلوبِ بیان کچھ ایسا رکھا ہے کہ حضرتِ زینبؑ کے دردناک حالاتِ زندگی گریہ خیز ہونے کے باوجود سبق آموز بھی رہے، اور یہ کتاب ہماری عورتوں کے لیے بالخصوص ایک اخلاقی دستور العمل بن گئی۔

حضرت آشہر نے اس کتاب کی تالیف میں تاریخ و سیرت کی معتبر کتابوں کے علاوہ عربی، فارسی، اردو کے شعر و ادب سے بھی کام لیا ہے۔ کتاب کا وہ باب جس کا عنوان ہے "اردو مرثیہ اور حضرت زینبؑ" ادبیات کا ذوق رکھنے والوں کے لیے خاص کر بہت دلچسپ ہے۔ اس باب سے یہ بھی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جناب آشہر نے کلامِ انیس کا مطالعہ کس دقتِ نظر کے ساتھ کیا ہے، اور جو لطائف و نکات ان میں پوشیدہ ہیں اُن کو بیان کرنے پر انھیں کتنی قدرت حاصل ہے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ یہ کتاب ہر طبقے میں مقبول ہوگی۔

سید مسعود حسن رضوی (ادبستانِ لکھنؤ)

۶ جولائی سنہ ۱۹۴۴ء

(۴) عالی جناب پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی ایم اے صدر شعبۂ فارسی و اردو، آگرہ یونیورسٹی (رجسٹرار جامع اُردو آگرہ)

میرے مکرم دوست جناب آغا اشہر لکھنوی نے "زینتِ کربلا" تصنیف فرما کر ایک بڑی کمی کو پورا کیا ہے۔ بقولِ اقبال:

حافظِ رمزِ اخوت مادران قوتِ قرآن و ملت مادران

مگر اب یہ زمانہ آگیا ہے کہ ہماری مائیں، بہنیں اور بیٹیاں اسلامی و معاشرتی تعلیمات سے قطعاً ناواقف ہوتی ہیں۔ نتیجہ یہ کہ افرادِ قوم ہیں:

سیرتِ فرزندہا از امہات — جوہرِ صدق و صفا از امہات (اقبال)

کا مصداق ناپدید ہے۔ جس کا اثر اعمال و عقائد، اور سیرت و کردار پر یکساں نمایاں ہے۔ علامہ اقبال سیدۃ النساء حضرتِ فاطمہ زہرا کی سیرتِ پاک کو مسلمان عورتوں کے لیے "اسوۂ کاملہ" قرار دیتے ہیں:

مزرعِ تسلیم را حاصل بتولؑ — مادراں را اسوۂ کامل بتولؑ

مگر سچ پوچھیے تو ہم میں چند فیصدی بھی ایسے نہ ملیں گے جن کو خانوادۂ رسالت کی سیرت کا مطالعہ کرنے کی توفیق ہوئی ہو۔

انھیں برگزیدگانِ آفاق میں سے حضرتِ زینبؑ بنتِ علیؑ ہیں۔ جن کی حیاتِ پاک عالمِ اسلامی کے لیے نمونہ کامل ہے۔ اور جن کی تقلید موجبِ نجات و سعادت۔ ایسی ہی مخدرات کی بابت اقبال نے کہا ہے:

آتشِ ما را بہ جانِ خود زند — جوہرِ او خاک را آدم کند
در ضمیرش ممکناتِ زندگی — از تب و تابش ثباتِ زندگی
السرِ ما از ازحمند بہای او — ما ہمہ از نقشبند بہای او

حضرتِ زینبؓ کی سیرت کا مطالعہ ہر عورت اور خصوصاً مسلمان عورت کے لیے لازمی ہے۔ جس میں اُن کے لیے زندگی کے سب نشیب و فراز اور فرائض اُمومت کے مختلف مدارج جلوہ پاش نظر آتے ہیں۔ اور جن کی تقلید ایک عورت کو کاملیت عطا کر سکتی ہے۔

ہمیں آغا اشہر صاحب کا ممنون ہونا چاہیے کہ جنابِ موصوف نے حضرتِ زینبؓ کی سیرتِ پاک ترتیب دیکر اُردو ادب میں ایک وقیع اور مفید اضافہ کیا ہے۔ اشہر صاحب بحیثیت اہلِ زبان اور مصنف کے اس قدر مشہور ہیں کہ میرا آپ کی بابت کچھ تحریر کرنا بیجا سا ہے۔ مجھے تو صرف جناب کی اس محنت و کاوش کو سراہنا ہے جو آپ نے اس کتاب کی تالیف میں صرف فرمائی ہے۔ جس کے لیے مجھے یقین ہے کہ تمام ملتِ اسلامیہ آپ کی ممنون ہو گی مجھے یہ بھی قوی توقع ہے کہ آپ کی یہ محنت سعی مشکور ہو گی اور خصوصیت سے ہماری مائیں اور بہنیں اس کتاب سے کما حقہ بہرہ مند اور مستفید ہونگی۔ کیونکہ صرف وہی عورت جو دینی تعلیم میں کامل ہو "زندگی کا سوز" اور "شرف کا درِ مکنون ہے"۔ وجودِ زن سے ہے تصویرِ کائنات میں رنگ اسی کے ساز سے ہے زندگی کا سوزِ دروں

شرف میں بڑھ کے ثریا سے مشتِ خاک اسکی — کہ ہر شرف ہے اسی دُرج کا دُرِ مکنوں
مکالماتِ فلاطوں نہ لکھ سکی لیکن — اسی کے شعلے سے ٹوٹا شرارِ فلاطوں
(اقبال)

محمد طاہر فاروقی
۱۱ اگست سنہ ۱۹۴۴ء

(۵) عالیجناب سید شہنشاہ حسین صاحب (ایڈوکیٹ)
سابق مدیر "خیابان" لکھنو

کتاب پڑھی، آنکھیں کھل گئیں۔ آپ نے وہ کیا جو بڑے بڑوں سے نہ ہو سکا۔ جزاک اللہ! نواب نصیر حسین خیال مرحوم نے سچ کہا تھا "شہر کو سوانح لکھنے کا ڈھب یاد ہے"۔

شہنشاہ حسین رضوی

(۶) عالی جناب سر ناظم الدین بالقابہٗ (وزیر اعظم بنگال)

اب زمانہ آ گیا ہے کہ خواتین اسلام بھی معاشرتی، تمدنی اور سیاسی ذمہ داریوں کا احساس کریں اور ہر قربانی کے لیے تیار ہو جائیں۔

ناظم الدین
نظام الدین
(کلکتہ)

تصدیر الکتاب

(۲) بقلم فاضل الاجل حضرت محمد حسن الاعظمی (من علماء الازهر) والمدرس السابق بالجامعة المصریة القاهرہ)

هذا الکتاب یتضمن طرفا من حیات سیدة زینب
بنت امیر المؤمنین علی ابن ابی طالب کتبه الفاضل
المحقق الاستاذ الاشهر والکتاب۔ علی صغرہ۔ یجدی
کثیرا علی القراء وأصحاب التراجم وبعد فاتحة طیبة
لکتب اخری تفصل الکلام فی حیات الزعماء والابطال
ویزید نا عنایته بهذا الکتاب أن مؤلفه الفاضل
اجتهد فی تالیفه وجدّ فی مراجعة کتب کثیرة۔ واحتمل
کثیرا من المشقة فی هذا السبیل النبیل ومن قلّب
صفحات هذا الکتاب ودقق فی مصادرہ وراجع ما یحتوی
من الاخبار الصادقة والاحوال الجامعة عرف مقدار
المشقة التی احتملها الاستاذ الاشهر فی وضع هذا
الکتاب۔ الصغیر حجمه العظیم نفعه۔

انّ التاریخ مرآة الماضی ومنار الحاضر وهو

لن یکون مرآة ابتید صقلها حتی تتضح فیها صورة الماضی، ومنارة یشع نورها براقاً یستضئ به الحاضر الا اذا قام علی ذکر الحقائق الکاملة المستقاة من اوثق المصادر، لا یتسرب الیها شک ولا تشوبها ریبة۔ وانی أشکر المؤلف الفاضل واحمد له اجتهاده وحسن نیته، والله یوفقه وایانا للعمل الخالص ابتغاء مرضاته۔

محمد حسن الاعظمی

(الوارد فی الدکن)

۲ جون سنہ ۱۹۴۴ء

بعونہٖ

چونکہ یہ تالیف

حضرت علّام

مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہ

کے

آفتابِ علم سے مقتبس ہے

لہذا

ذرّے کو آفتاب سے انتساب کا حق حاصل ہے

حقیر

مؤلف

عرضِ افتتاحی

حیاتِ رشید مرحومؒ کے اختتام کے بعد ۱۳۴۵ھ میں سب سے پہلے مجھے سوانح جنابِ زینبؑ لکھنے کا خیال پیدا ہوا۔ چنانچہ میں نے عزیز مرحوم سے ذکر کیا۔ مرحوم نے کہا اگر چاہتے ہو کہ تالیف مقبول و مستقل ہو تو حضرت شمس العلما مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ سے مشورہ لو۔ میں نے کہا آپ نے کہا تو ٹھیک اچھا چلیے۔ لہذا میں اور عزیز مرحوم لکھنؤ پہنچے۔ دوران گفتگو میں مجوزہ تالیف کا ذکر کیا گیا۔ جناب مغفور نے مسکرا کے فرمایا: "یہ حیاتِ رشید نہیں ہے بہت محنت کرنی ہوگی"۔ میں نے عرض کی "صرف جناب کا کرم علمی درکار ہے"۔ فرمایا ان کتابوں کا مطالعہ ضروری ہے:

۱۔ بحار الانوار (جلد دہم)
۲۔ نور الابصار (علامہ شبلنجی)
۳۔ تذکرہ خواص الامہ (سبط ابن جوزی)
۴۔ ینابیع المعاجز (سید ہاشم بحرینی)
۵۔ رسالہ زینبیہ (علامہ سیوطی)
۶۔ طراز المذہب (سپہر کاشانی)
۷۔ اتمام النعمۃ (مولانا کمال الدین)
۸۔ معارف (ابن قتیبہ)
۹۔ خصائص زینبیہ (مولانا نور الدین زنجانی)
۱۰۔ اسعاف الراغبین (محمد الصبان)

اس وقت اردو میں جنابِ زینبؑ کے متعلق کوئی تالیف نہ تھی۔

میں نے مصمم ارادہ کیا کہ جلد ختم کر دوں۔ لیکن اول تو کتابیں فراہم کرنے اور اُن کے مبسوط مطالعے میں وقت صرف ہوا۔ دوسرے زمانے نے فرصتِ مشغولیت بہت کم دی۔ مگر اس درمیانی وقفے میں تالیف کے خیال سے غافل نہیں رہا۔ کبھی کبھی جنابِ مرحوم سے استفسارِ امر کرلیا کرتا تھا۔ اُن کے انتقال کے سانحۂ جانگزا کے بعد مصمم ارادہ ہوگیا کہ تالیف کو جلد سے جلد ختم کرنا چاہیے۔ بہت سے میرے خوش ہونے والے کرم فرما جو تکمیلِ تالیف کے مشتاق تھے عازمِ جنت ہوئے۔ مثلاً پروفیسر ناصری۔ جنابِ عزیزؔ' جنابِ محشرؔ رحمہم اللہ علیہم۔

افسوس کہ اس وقت حضرت ناصر الملۃ موجود نہیں لیکن بحمد اللہ اُن کا نامِ نامی برقرار رکھنے والے حضرت مولانا سید محمد سعید صاحب قبلہ موجود ہیں۔ میرا فرض تھا کہ یہ مسودہ اُن کی خدمت میں پیش کروں۔ جنابِ موصوف نے ملاحظہ فرما کر ممنونِ کرم کیا۔

آخر میں فاضلِ محترم جناب مولانا سید محمد نواب صاحب ایم اے۔ ایل ایل بی۔ کی نظرِ مکرمت اثر کا ممنون ہوں لکھنؤ

ایک اور جید الاستعداد مگر مستغنی المزاج فرد نے۔ جو سہر شمارِ جامِ ولایت ہیں۔ بعض اشعارِ عربی کے ترجمے میں ترقی لفظ تجویز فرمائی جسے شکریہ کے ساتھ قبول کیا گیا لیکن اظہارِ اسمِ گرامی کی اجازت نہیں دی۔

خصوصیات

۱۔ حتی الوسع عربی عبارت کم اور ترجمہ زیادہ ہے۔

۲۔ طرزِ تحریر بہت سادہ اور عام فہم ہے۔ تاکہ خواتین دلچسپی سے پڑھیں اور اپنے مذاق کے مطابق اثر لیں۔

۳۔ واقعاتِ سخت کی تحریر میں جن الفاظ و تراکیب سے کام لیا گیا ہے، خواہ وہ کیسے ہی غم انگیز ثابت ہوں۔ لیکن ایسے مقامات پر بھی قربانی کا روشن پہلو دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔

۴۔ دو مقاموں پر عربی اشعار کا ذکر ہے۔ جس سے صرف علمی دلچسپی مقصود ہے۔

اس وقت اردو تالیف کے میدان میں جنابِ زینب سلام اللہ علیہا کے متعلق دو تین رسالے موجود ہیں۔

آخر میں حقیر مؤلف بھی اپنا سرمایۂ محنت پیش کرتا ہے۔

گر قبول افتد زہے عزو شرف

متوسل سلسلۂ مرتضویہ
سید آغا اشہر لکھنوی

سالکِ راہِ حق بیا طورِ ہدیٰ نماطلب
نورِ حقیقت از درِ عترتِ مصطفےٰ طلب

یوں تو باختلافِ مورخین علاوہ پندرہ صاحبزادوں کے حضرت علی مرتضیٰؑ کی مختلف ازواج سے ۱۸، ۲۰ یا ۲۲ صاحبزادیاں تھیں اس وقت جن کا ذکر طوالت کا باعث ہوگا لیکن جن صاحبزادی کے واقعاتِ حیات کو عالمِ اسلام میں ایک اہمیت حاصل ہے وہ جناب زینب بنتِ فاطمہؑ ہیں بطنِ جنابِ فاطمہ زہراؑ سے یہ اولادیں ہوئیں:

(۱) تین بیٹے: حسنؑ، حسینؑ اور محسنؑ جو کمسنی میں انتقال فرما گئے۔

(۲) تین بیٹیاں: زینبؑ، ام کلثومؑ، رقیہؑ بعضوں نے ام کلثوم زینب کبریٰ ہی کی کنیت لکھی ہے۔

اگرچہ دخترانِ جنابِ فاطمہؑ کی تعداد میں اختلاف ہے لیکن مذکورہ تین ناموں سے اکثر مورخین اتفاق کرتے ہیں۔ چونکہ اس تالیف کا مقصد جناب زینب خاتون کا ذکر ہے، لہٰذا اختلافات عاملہ یا اُن کی کنیت و لقب میں شبہات خارج از بحث ہے۔

ولادتِ جنابِ زینبؑ

جنابِ زینبؑ ولادتِ امام حسینؑ کے دو سال بعد پیدا ہوئیں۔ چونکہ امامِ حسینؑ کی ولادت بالاتفاق ۳ شعبان ۴ھ میں ہوئی لہٰذا جنابِ زینبؑ کی ولادت اولِ شعبان ۶ھ میں صحیح معلوم ہوتی ہے۔ اس تاریخ کے علاوہ اس بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اور اُس کے متعلق جو اختلافات ہیں، وہ عقلاً صحیح معلوم ہوتے ہیں۔

مثلاً بعض نے لکھا ہے کہ ولادت جنابِ زینبؑ آخرِ ماہِ رمضان ۹ھ میں واقع ہوئی، جس وقت جنابِ رسالتمآبؐ سفرِ تبوک میں تشریف لے گئے تھے۔ قابلِ غور یہ امر ہے کہ آنحضرتؐ نے ۱۰ھ میں رحلت فرمائی، اُس وقت جنابِ فاطمہؑ کے بطنِ مبارک میں جنابِ محسن تھے۔ اس قول سے ایک سال میں دو حمل قرار پاتے ہیں اور یہ خلافِ قانونِ فطرت ہے۔ لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ غالباً ۶ھ میں جنابِ زینبؑ کی ولادتِ باسعادت واقع ہوئی۔ ۸ھ کے مابین جنابِ اُمِّ کلثومؑ معرضِ وجود میں آئیں، اُس کے بعد ۱۰ھ میں جنابِ محسنؑ۔

صاحبِ قاموس کی تحقیق میں (زینب) زَنب سے مرکب
ہے جس کے معنی (فربہ) کے ہیں مستوراتِ عرب میں دستور
ہے کہ جو لڑکی موٹی تازی ہوتی ہے اُس کو پیار سے زینب کہہ کے
پکارا جاتا ہے (یا اُمِ شحمہ) جس طرح ہندوستان میں جو بچی
گلگوتھنا سی ہوتی ہے اکثر ماں باپ اور بزرگِ خاندان اُسے
(بی ستلی) کہہ کے پکار لیا کرتے ہیں، حتیٰ کہ کبھی کبھی جوان ہونے
تک بھی اس نام سے پکاری جاتی ہے۔
دوسرے معنی (زینب) کے نیک منظر یا خوشبودار
درخت کے ہیں۔ بچوں کا بوٹا سا قد، پھول سا چہرہ، نرگسی
آنکھیں، جن پر معصومیت کا نورانی منظر ہر وقت چھایا رہتا ہے،
اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ انھیں استعارتاً ایسے لفظ سے
موسوم کیا جائے جس میں آیندہ پھولنے پھلنے کی دعا شامل ہو۔
اکثر ایسا ہوتا ہے کہ بنابرِ فصاحتِ کلامِ انسانی قد کو
سرو، شمشاد سے اور دوسرے اعضا کو مختلف گل و ریاحین
سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لہٰذا اس تزئینِ کلام کے سلسلے میں مجھے
کلامِ الٰہی کی سند پیش کرنی پڑی چنانچہ ارشاد فرمایا ہے:

شَجَرَۃٌ طَیِّبَۃٌ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّفَرْعُھَا فِی السَّمَآءِ
وہ پاک و پاکیزہ شجر جس کی جڑ زمین میں اور شاخیں آسمان میں ہیں
رسالتمآب اور اُن کے اہلِ بیت طاہرین کی جسمانی اور روحانی
معراج کا آئینہ دار ہے۔ یا قول رسالت مآب اَنَا وَ عَلِیٌّ
مِنْ شَجَرَۃٍ وَّاحِدَۃٍ۔ میں اور علی ایک ہی نورانی شجر کی
دو شاخیں ہیں۔

ان تشبیہاتِ کلام کے سلسلے میں جنابِ فاطمہؑ کی ذات
مبارکہ چھوٹی جاتی تھی۔ ایک حدیثِ نبویؐ نے اُن کو بھی اس آیت
کے مفہوم میں شامل کر لیا۔ جناب ابو سعد، شرف النبوہ میں
جنابِ عائشہؓ کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ اُنھوں نے حضورِ
رسالت میں ایک روز عرض کی "یا رسول اللہ کیا وجہ ہے
کہ جب فاطمہؑ آتی ہیں تو آپ اپنی زبانِ مبارک اُن کے دہن
میں رکھ دیتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے شہد کے مزے لے
رہے ہوں"۔ رسول اللہ نے جواب میں ارشاد فرمایا "جبرئیل
نے مجھے ایک سیب جنت دیا تھا، لہٰذا جب میں اُس کی لذت
و خوشبو کا مشتاق ہوتا ہوں تو فاطمہؑ کے بوسۂ لب و دہن
سے حاصل کرتا ہوں"۔

حسنینؑ کے متعلق بھی بالاتفاق یہ حدیث بیان کی جاتی ہے "الحسنُ والحسین ریحانتای فی الجنۃ" حسن وحسین میرے دو جنتی پھول ہیں۔ اس سے تو میرے نظریہ تزئین کلام میں اور تقویت ہوجاتی ہے۔

اگر (زینب) کے معنی نیکو منظر اور خوشبودار درخت کے لیے جائیں تو بھی یہ ابہام قابلِ قبول ہے۔ اس وجہ سے کہ جناب زینبؑ کے چہرۂ نورانی کی نیکو منظری پر ارشادِ نبوی شاہد ہے کہ وہ صورتاً جناب خدیجہؑ (زوجۂ رسولؐ) سے بہت مشابہ تھیں جن کے جمالِ مبارک کے متعلق عام مورخینِ عرب لکھتے ہیں (کانت سیّدتنا خدیجہ من اجملِ نساءِ القریش واعقلہا۔ وکانت تسمّی بملیکۃُ العرب وتعرف بسیّدۃِ البطحاء) جنابِ خدیجہؑ زنانِ قریش میں سب سے زیادہ حسین اور عقلمند تھیں۔ انھیں لوگ ملکۂ عرب اور سیدۂ بطحا کہتے تھے۔

اب رہے (زینبا) کے تیسرے معنی (زینُ اب) یعنی باپ کی زینت۔ تو اس معنی کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بھی وہ صرف ماں باپ ہی کے لیے باعثِ زینت نہ تھیں

بلکہ بعدِ جنابِ فاطمہؑ تمام زنانِ بنی ہاشم میں جن کو تاریخ اسلام
اہمیت دیتی ہے صرف جنابِ زینبؑ ہی وہ خاتون ہیں
جن کی ذات سے رسول اللہؐ کے سلسلۂ اناث کا فخر و مباہات
وابستہ ہے۔ حتیٰ کہ اُن کے علم و عمل کا مرتبہ جنابِ فاطمہؑ کے
مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔

جس دختر کو علیؑ مرتضیٰؑ ایسے بابِ مدینۂ علم نے پڑھایا
لکھایا ہو، اور فاطمہؑ ایسی ماں نے زیرِ تربیت رکھا ہو اُس
کے فضائل ظاہری و باطنی میں کونسی کمی رہ سکتی تھی۔ چنانچہ سانحۂ
کربلا کے سلسلے میں جہاں سے جنابِ زینبؑ کی اصلی عظمت
و شہرت منظرِ عام پر آتی ہے، اُن کے تمام اقوال و افعال کو
اُن کے والدین ہی کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔

دخترِ بزرگ ہونے کی حیثیت سے تو وہ خاتونِ جنت
جنابِ فاطمہؑ کی جانشین تھیں ہی۔ لیکن تعجب یہ ہے کہ جہاں
جہاں حضرت زینبؑ نے مسلسل تقریر کی ہے تو بلا تفاق
واقعۂ کربلا لکھنے والوں نے خبر دی ہے کہ اس کلام
سے بولی ہی نہیں کہ معلوم ہوتا تھا علیؑ بن ابی طالب اپنے خاص
لہجے میں خطبہ ارشاد فرما رہے ہیں۔

واہ ری علیؑ کی عالمہ بیٹی! باپ کی اُس علمی وراثت میں بھی شریک ہوگئی، جو صرف حسنؑ و حسینؑ کا حق تھا صرف یہیں تک نہیں، بلکہ اس تالیف میں آگے چل کے معلوم ہوگا کہ کیسے کیسے نازک موقعوں پر اس لاجواب بی بی نے اپنے والدین بلکہ خود رسول اللہؐ کے نام کو روشن کردکھایا ہے۔ اور اپنے آپ کو اسم بامسمیٰ ثابت کیا ہے۔ (اسی معنویت کے ماتحت اس تالیف کا نام **زینبِ کربلا** رکھا گیا ہے۔)

زینب نام کی مشہور خواتین اسلام

اس وقت تک تاریخِ زنانِ اسلام میں زینب نام کی پانچ خواتین مشہور رہیں:

(۱) زینب بنت محمدؐ ۔ جن کا عقد قبلِ ہجرت ابو العاص سے ہوا۔ کفار کی طرف سے جنگِ بدر میں لشکرِ اسلام سے لڑے، اور گرفتار ہوئے۔ چونکہ اُس وقت تک وہ مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ اُن کے خسر حضرتِ رسول اللہؐ نے اس شرط پر رہا کیا کہ وہ اپنی زوجہ زینب کو مدینے بھیجدیں۔ لہذا بدر سے واپس

ہونے پر ابوالعاص نے مطابق عہد جنابِ زینبؑ کو ایک اونٹ پر سوار کر کے اپنے بھائی کنانہ کے ساتھ مدینے روانہ کر دیا۔ راستے میں جبار نے جو اسم با مسمیٰ اور کفارِ قریش سے تھا، جنابِ زینبؑ پر ایسا وار کیا کہ بیچاری عماری سے نیچے گر پڑیں اور اسقاطِ حمل ہو گیا۔ مدینے پہنچنے کے بعد سخت امراضِ نسوانی میں مبتلا ہو گئیں۔ اور ۸ھ میں انتقال کیا۔ انھیں کی نیک صاحبزادی اُمامہ سے علی مرتضیٰؑ نے حسب وصیّتِ جنابِ فاطمہؑ عقد کر لیا تھا، جن کی عمر وقتِ نکاح تقریباً پندرہ سال کی ہو گی۔

---

(۲) زینب بنتِ جحش۔ رسولؐ کی پھوپی زاد بہن اول زید بن حارث کے نکاح میں تھیں، اُن سے طلاق کے بعد ۵ھ میں آنحضرتؐ کے نکاح میں آئیں۔

(۳) زینب بنتِ خزیمہ بن الحرث۔ خاندانِ عامری سے ہیں۔ کثرتِ خیرات اور حبِّ مساکین کی وجہ سے اُم المساکین کُنیت ہوئی۔ ۳ھ میں بعدِ شہادتِ شوہر (ایک غزوہ میں) رسولؐ کے نکاح میں آئیں۔

(۴) زینب بنتِ ام سلمہ۔ جن سے متعدد احادیث صحیحین میں منقول ہیں۔

(۵) زینب بنت الطثریہ۔ اس خاتونِ عرب پر ادبی حیثیت سے نظر پڑتی ہے۔ اس کے حقیقی بھائی یزید کو بنو حذیفہ نے وادیٔ عقیق میں قتل کر دیا تھا۔ بہن نے بھائی کے غم میں ایک مرثیہ کہا جس میں جود و سخا، مروت و عطا، سبھی کا ذکر ہے جو دیوان حماسہ (باب المراثی) میں نقل کیا گیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ یہ نظم صحیح وارداتِ حزن و ملال کا مرقع ہے، جو ایشیا میں عربی شاعری کے لیے مخصوص ہے۔ اس مرثیے کا آگے ذکر کیا گیا ہے، جہاں زینبؑ بنت علیؑ کے اس مرثیے کا ذکر ہے جو اُن مظلومہ نے اپنے ماں جائے حسینؑ کے غمِ جانکاہ میں نظم کیا ہے۔ غرض یہ ہے کہ غمِ برادر میں ان دونوں خواتین عرب میں سے کس کے جذباتِ الم زیادہ موثر ہیں۔

(۶) زینبؑ بنتِ علیؑ۔ جنھوں نے تکمیلِ فضل و شرفِ اہلبیت پر اپنے کردارِ حسنہ سے آخری مُہر لگا دی۔

بہرحال جس وقت جناب زینبؑ عالمِ وجود میں تشریف لائیں تو حضرت رسالت مآب کی خدمت میں اطلاع دی گئی کہ آپ کی صاحبزادی کے یہاں دخترِ نیک اختر پیدا ہوئی ہے۔ آنحضرتؐ بیت الشرفِ فاطمہؑ میں تشریف لائے اور فرمایا لاؤ میری گود میں دیدو۔ فنذاقہؑ معصومہ آغوشِ رسالت میں رکھدیا گیا۔ آپ نے فرطِ محبت سے نوزائیدہ کو گلے سے لگالیا۔ اپنے نورانی رُخسار پھول سے گالوں پر رکھ دیئے لیکن چشمِ مبارک سے آنسو جاری ہوگئے۔ جنابِ فاطمہؑ نے عرض کی "بابا خداوندِ عالم آپ کو کسی غم میں نہ رُلائے یہ آپ کیوں روتے ہیں" فرمایا "تیری یہ نورِ نظر ہم سب کے بعد سخت رنج و محن میں مبتلا ہوگی"۔ ماں کی للک مشہور ہے عرض کی "تو بابا اس کی تکلیفوں سے جو متاثر ہوگا اُسے کیا اجر ملے گا"۔ ارشادِ نبوی ہوا۔ "اُسے وہی ثواب ملے گا جو ہمیشِ خدا حسینؑ پر گریہ کرنے کا ہے۔ اُس کے بعد آنحضرتؐ نے مولودہ کا نام زینب رکھا۔ اور فرمایا کہ یہ بچی اپنی خالہ زینبؑ (بنت رسول) سے مشابہ ہے۔

دوسری روایت میں ہے کہ جناب فاطمہ نے ولادت

ولادتِ جنابِ زینبؑ کے چند روز بعد علی بن ابی طالبؑ سے کہلوایا کہ مولودہ کا نام تجویز کر دیں۔ اُنھوں نے جواب دیا۔ "میں حضرت رسالت مآب کے تجویز کیے ہوئے نام کو بہتر سمجھوں گا۔" چنانچہ جب حضرت سفرِ تبوک یا کسی دوسرے سفر سے واپس تشریف لائے تو جنابِ سلمانؓ نے حضورِ نبوی میں ولادتِ دختر کی خبر دی۔ اسی دوران میں فرشتہ نازل ہوا اور خلاقِ کون و مکاں کی جانب سے تجویزِ اسم زینب کی خوشخبری سنائی۔

شاعرانہ توجیہ

لفظِ زینب کی ایک دلچسپ شاعرانہ توجیہ بھی سن لیجیے وہ یہ کہ جس طرح اُن معظمہ کا گوشت پوست پنجتن میں شامل ہے اسی طرح ز، ی، ن، ب کے اجزائے ترکیبی بھی اسمائے پنجتن کے حروفِ ترکیبی میں شامل ہیں، چنانچہ (ز) زہرا سے۔ (ی) علی مرتضیٰ سے۔ (ن) حسنینؑ سے۔ (ب) نبی برحق سے۔

میرزائے قمی صاحبِ (قوانین) لکھتے ہیں کہ جنابِ زینبؑ کا اسمِ شریف حصولِ مقاصد کے لیے

عجیب اثر رکھتا ہے۔ یہ قول کچھ بعید بھی نہیں معلوم ہوتا۔
اس وجہ سے کہ وہ مظلومہ شہدائے کربلا کی طرح منظورِ نظر
رسالت اور مقبولِ بارگاہِ الٰہی ہیں۔

کنیت

آپ کی کنیت میں اختلاف ہے۔ بعض اُم الحسن
بتاتے ہیں اور بعض اُم کلثوم وغیرہا۔ اسی بنا پر بعض
خطبے اور مرثیے جو جنابِ اُم کلثوم سے منسوب ہیں۔
جنابِ زینبؑ ہی کے کہے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ
اُن کی کنیت اُم کلثوم بھی ہو۔ کیونکہ یہ نام ایک دختر
رسول کا بھی تھا۔ جس طرح اوپر مذکور ہوا کہ زینب بھی
رسول کی صاحبزادی تھیں۔ عرب میں یہ قاعدہ ہے کہ لڑکے
یا لڑکی کو بزرگوں کے نام سے بطور (کینت) کے پکارتے
ہیں، اور یہ رسم بچوں کی طولِ عمر کے لیے نیک شگون سمجھا
جاتا ہے۔ چنانچہ امام حسینؑ نے بھی اپنے فرزندوں کے
نام پدر بزرگوار کے نام پر رکھے تھے۔ صرف۔ اکبرؑ اوسط
اصغر سے رفعِ اشتباہ کر دیا تھا۔ بعض نے اعتراض کیا کہ آپکو
فرزندوں کے لیے دوسرا نام نہیں ملتا۔ ارشاد ہوا کہ

اگر خداوندِ عالم مجھ کو سو فرزند عطا فرمائے تو سب کا نام (علی) ہی رکھوں گا۔

کُنیت

کنیت کا رواج عرب کے سوا عجم میں کبھی نہیں' اور ہے بھی تو عربوں کی دیکھا دیکھی۔ البتہ ہندوستان میں اڑوس پڑوس کی ہمسائیاں' یا محلّے کی عورتیں ایک دوسری کو اماکی کی اماں۔ یا۔ ڈھماکی کی خالہ۔ کہہ کے بھلے پکار لیں۔ لیکن یہ کنیت وقتی ہوتی ہے مستقل نہیں۔ البتہ میاں بیوی یا وہ بھی ادھیڑ عمر پر پہنچ کے۔ اے جی دیکھو تو۔ اور۔ ارے بھئی سُنو تو سہی۔ کیسے بجائے۔ منّی کے ابا زرا یہاں آنا۔ یا۔ جیجی کی اماں۔ ہاں تو منا ماں وغیرہ کا رواج ہو جاتا ہے۔ جو آخر وقت تک بلکہ بعد تک (اللہ بخشے) کے اضافے کے ساتھ نباہ دیا جاتا ہے۔ واقعۂ کربلا کے بعد سے جنابِ زینبؑ کی کنیت ام المصائب ہو گئی۔

لقب

جنابِ فاطمہؑ دخترِ رسولؐ کا لقبِ شریف صدیقۂ کبریٰ (بڑی سچی بی بی) تھا۔ چونکہ جنابِ زینبؑ علم و عمل' عادات و خصائل' حرکات و سکنات میں اپنی مادرِ محترمہ

کی زندگی کی زندہ تصویر تھیں اس وجہ سے اُن کا لقب صدیقۂ صغریٰ اور عصمتِ الصغریٰ ہے۔

فضائلِ انسانی میں عصمت ایک ایسی فضیلت ہے جو قدرت کی طرف سے اُنھیں مقدس ذاتوں سے مخصوص کر دیگئی ہے جو مخلوق کے لیے کوئی نورانی پیغام لے کے آئی ہوں۔ چنانچہ مردانِ اہلِ بیت میں جنابِ رسولِ خداؐ کے بعد شدائدِ اُمت پر صبر کرنے کا تمغہ بارگاہِ احدیت سے حسینؑ شہیدِ کربلا کو عنایت ہوا۔ اور زنانِ اہلبیت میں جنابِ فاطمہؑ کے بعد اُن کی دخترِ محترمہ جنابِ زینبؑ نے جوہرِ صبر میراث میں پایا۔

تیسرا لقب "شریکۃ الحسین" ہے۔ یہ لقب بہت مناسب معلوم ہوتا ہے، کیونکہ بعض اخبار سے معلوم ہوتا ہے، کہ اُن کو ابتدا ہی سے اپنے مانجلے حسینؑ سے خاص اُنسیت تھی، یہاں تک کہ عہدِ طفلی میں بھی اگر بھائی کو دیکھے ہوئے عرصہ گذر جاتا تھا تو بیتاب ہوجایا کرتی تھیں۔ اور جب تک دیکھ نہ لیتی تھیں چین نہیں آتا تھا۔

اسی طرح جہادِ نفسانی و روحانی میں وہ کربلا سے دمشق تک

حسینؑ کی شریک رہیں۔ عصمت و طہارت۔ علم و فضل فصاحت و بلاغت، لب و لہجہ غرض ہر پہلو سے دینِ حق کی ذمہ دارانہ کسوٹی پر پوری اتریں۔ دوسرے القاب نائبۃ الزہرا عقیلۂ بنی ہاشم وغیرہ ہیں۔ ابنِ عباسؓ نے جب کوئی حدیث جنابِ زینبؑ کے حوالے سے بیان کی ہے تو اسی لقب سے یاد کیا ہے۔ حدثتنی عقیلتنا زینب کذا وکذا (ہمارے خاندان کی عقلمند خاتون زینب نے ایسا ایسا کہا ہے)

جنابِ زینبؑ خواتینِ اسلام کی نظر میں

یوں تو رسالت مآبؐ اور اُن کے اہلِ بیت کی سیرت حسنہ کا مجموعہ تمام مسلمانوں کے لیے ایک عمدہ دستور العمل ہے جس پر دُنیائے اسلام جس قدر ناز کرے بجا ہے لیکن خواتینِ اسلام کے لیے شدائد و مصائبِ زندگی کے مواقع پر صبر و تحمل کا جو لائحۂ عمل جنابِ زینبؑ نے پیش کیا ہے وہ اپنی آپ ہی مثال ہے۔

قدرت نے عورتوں کا دل بہت نرم و نازک خمیر سے بنایا ہے، جس میں لطیف احساسات اور خوبصورت جذبات کی

ایک دُنیا پرورش پاتی ہے۔ کسی وقت اگر وہ کہہ اُٹھیں کہ حفاظت حق کے لیے امام حسینؑ نے کربلا میں سخت ترین مصائب اُٹھائے تو کوئی کمال نہیں کیا، کیونکہ خداوند عالم نے اُن کو مردانہ صورت عنایت فرمائی تھی، بردباری و بہادری جس کے خاص جوہر۔ زخم نیزہ و شمشیر جس کے زیور ہیں۔ ایسا نہ کرتے تو مرد کیسے تھے۔ اور پھر بنی ہاشم کے سلسلے سے تعلق رکھنے والے جس میں حمزہؑ و جعفرؑ، علی مرتضیٰؑ ایسے بہادر اور تلوار کے دھنی گذر چکے ہیں جنھوں نے بانیٔ اسلام حضرت خیرالانام کے ساتھ کفار سے ایسی ایسی معرکہ آرائیاں کیں کہ انھیں کا دل جانتا ہوگا۔

یہ خیال بہت بجا، نہایت درست۔ لیکن کربلا کے خونیں منظر میں جس وقت جناب زینبؑ کو حسینؑ کے دوش بدوش دیکھتی ہیں، تو اُن کے چہرے کمہلاسے جاتے ہیں۔ دل مسوس کے رہ جاتی ہیں کہ اللہ! زینبؑ کے دل کو تو نے کیسی صبر کی دولت عطا فرمائی تھی کہ اس پامردی سے تمام شدائد کا مقابلہ کیا کہ جہاں مردوں کے چھکّے چھوٹ جاتے ہیں۔

فخر، اور سچا فخر ہونا چاہیے زنانِ اسلام کو جنابِ زینبؑ

کی ذات پر کہ اُن کی صنف میں بھی ایک ایسی فردگزری ہے جس نے ثابت کردیا کہ جہاں حفاظتِ دینِ حق کا سوال ہو وہاں اسلام کی عورتیں بھی اپنے دل وجگر سے وہی کام لے سکتی ہیں جو مجاہدینِ اسلام کا شیوہ ہے۔ اور اُن کو بھی رسول اللہ کے سامنے سُرخرو ہونے کا ویسا ہی موقع حاصل ہو سکتا ہے، جیسا شہیدانِ اسلام کو۔ مانا کہ حالاتِ جنابِ زینبؑ واقعۂ کربلا کے سلسلے میں عام مسلمانوں کو اور خاص کر خواتینِ اسلام کو حُزن و ملال کی دعوت دیتے ہیں؛ لیکن اس تالیف میں کوشش کی گئی ہے، اور غالباً کامیاب کوشش کہ بعض مواقع پر حق پسند مسلمانوں کو فرحت روحانی بھی حاصل ہو جائے۔ اور اہلِ بیت سے محبت رکھنے والی خواتین کے چہروں پر خاتونِ کربلا کے اسلام پرور کارناموں سے بشاشت کے آثار پیدا ہو جائیں۔

تعلیم و تربیت

بچوں کے جسمانی نشو و نما کے ساتھ اُن کے ذہن و ادراک کی ابتدائی ترقی کی مناسبت سے علم و ادب کی

تعلیم بھی ضروری چیز ہے، جس کے بغیر انسانیت اَدھوری رہ جاتی ہے، بلکہ بعض موقعوں پر تو بالکل غائب ہو جانے کا اندیشہ رہتا ہے۔ یہ مانا کہ قدرت نے انسان کو مخلوقاتِ عالم میں بہترین صورت عنایت فرمائی ہے، اور لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ ۝ فرما کے اُس کا دل خوش کیا ہے۔ مگر وہ ظاہری جمال کس کام کا جس میں باطنی حُسن نہو۔ وہ ہیرا کس مصرف کا جس کے پہلوؤں پر تڑپ نہو۔ وہ آفتاب کس کام کا جس میں چمک نہو۔ خلاصہ یہ کہ وہ انسان انسان نہیں جس میں علم نہو۔ علم چونکہ ایک ملکۂ شریفہ ہے، لہذا ہر شریف خاندان یہ چاہتا ہے کہ اُس کے گھر نے میں اِس دولت کی کمی نہ رہے۔ اِس مقصد کے ماتحت کسی ممکن کوشش سے وہ دریغ نہیں کرتا۔ اگر کامیاب ہو جاتا، تو اُس کا بلکہ اُس کے آباو اجداد تک کا نام روشن ہو جاتا ہے۔ خصوصًا علمِ دین، جس کے متعلق مروی ہے کہ اگر خاندان میں ایک عالمِ دین پیدا ہو جاتا ہے تو خداوندِ عالم اُس کے آباؤ اجداد کی ارواح پر بارشِ

رخصت کر دیتا ہے۔ اگلے زمانے میں یہ دستور تھا کہ لڑکیوں
کو صرف مذہبی تعلیم دینا ضروری سمجھتے تھے۔ مگر موجودہ
دور میں لڑکیوں کو لڑکوں کے ہمدوش تعلیم دلائی جاتی
ہے، حتیٰ کہ جب اعلیٰ درجے کے امتحانات کی سندیں کبھی یونیورسٹی
کے جلسے میں تقسیم کی جاتی ہیں، تو پہلی صفیں اسی صنف
سے زینت پاتی ہیں۔
بھلا میں جناب زینبؑ کی تعلیم کے سلسلے میں اُس
پاک گھر والوں کا کیا ذکر کروں، جن کی نورانی آنکھیں صحیفہ
قدرت کا گہرا مطالعہ کر چکی تھیں۔ جن کی زبانیں علومِ نبوت
کے سرچشمے تھے؛ جن سے عرب و عجم کے پیاسے سیراب
ہوئے۔ انھوں نے بھی اپنے بچوں کی زینت روحانی
کے لیے وہی تدابیر اختیار کیں جن کی مسلمانوں کو تلقین کی گئی
تھی یعنی طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّمُسْلِمَةٍ
(ہر مسلمان مرد اور عورت کے لیے حصولِ تعلیم فرض ہے)
خاتونِ جنت کے گھر میں اللہ کے دیے دو چاند سے
فرزند تھے جن کے پڑھانے والے عالمِ ربانی علیؑ
مرتضیٰ ایسے فصیح و بلیغ باپ موجود۔ جن کے متعلق علمی دنیا

کہتی تھی " تَنْطِقُ الْحِكْمَةُ مِنْ لِسَانِهٖ (حکمت علیؑ بن ابی طالبؑ کی زبان کے ذریعے سے بولتی ہے) کیا اُٹھا رکھا ہوگا!

مکتبِ اہلِ بیت میں حسنؑ اور حسینؑ کے پہلو میں ایک نئی اور اپنی نوعیت کی پہلی طالبۂ علم نظر آرہی ہے۔ وہ کون۔ وہ معصومۂ زینبؑ۔ اس بی بی نے اپنے بھائیوں کے ساتھ مدارجِ علومِ ظاہری و باطنی طے کیے تھے۔ چنانچہ بعض روایات سے مستفاد ہوتا ہے کہ ایامِ خلافت امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ میں کوفے کی خواتینِ اسلام حضرتِ زینبؑ کی خدمت میں آیا کرتی تھیں۔ آپ سے تفسیر کلام اللہ سُنتی تھیں۔ اور قلوب کو منور کرتی تھیں۔ ایک روز حسبِ معمول تفسیر بیان فرما رہی تھیں، اتفاق سے پدرِ بزرگوار نے اپنی نورِ نظر کی تقریر سُنی، بہت خوش ہوئے۔ بعدِ ختمِ تقریر پوچھا۔ "بیٹی! تفسیر کھیعص بیان کر رہی تھیں؟ عرض کی۔" ہاں بابا۔" علیؑ مرتضیٰ نے فرمایا۔" ان مقطعات میں اور رموز ایسے بھی ہیں جن کا تمہیں علم نہیں۔" عرض کرتی ہیں" بابا وہ

کیا ہیں۔ فرمایا "آلِ محمدؐ پر آیندہ شدائد و مصائب آنے والے ہیں، جن کی طرف اُس میں خداوندِ عالم نے اشارہ فرمایا ہے۔ اُس کے بعد سارا واقعۂ کربلا بیٹی سے بیان فرما دیا۔ جس سے جنابِ زینبؑ بہت متاثر ہوئیں۔ (خصائصِ زینبیہ)

لطیفۂ علمی

علامہ شوشتری (مجالس المومنین) میں تحریر فرماتے ہیں: "ایک مرتبہ بچپنے میں جنابِ زینبؑ اور جنابِ عباسؑ علی بن ابی طالبؑ کے دونوں پہلوؤں پر بیٹھے تھے۔ حضرت نے جنابِ عباسؑ سے کہا: "کہو واحد (ایک)" عباسؑ نے تعمیلِ ارشاد کی۔ پھر فرمایا: "کہو اثنین (دو)" عباسؑ نے عرض کی: "بابا مجھے شرم آتی ہے کہ جس زبان سے ایک کہا ہے اُس سے دو کہوں"۔ (دریائے توحید کے شناور علی بن ابی طالبؑ اپنے فرزند کے اس جواب سے وجد کرنے لگے اور دہنِ مبارک چوم لیا)

فوراً ہی جنابِ زینبؑ نے عرض کی: "بابا! آپ تو

ہم سے محبت کرتے ہی ہونگے"۔ فرمایا "بے شک" زینب نے عرض کی: "بابا دو کی محبت ایک دل میں کیونکر ممکن ہے۔ اصلی محبت تو محبتِ خدا ہے۔ آپ کا نورانی دل جس سے لبریز ہے۔ اب رہی ہم لوگوں کی محبت۔ تو یہ ہو سکتا ہے کہ خداوندِ عالم کی طرف سے آپ کی ذات اولاد کے لیے رحمت و شفقت کا سبب قرار دی گئی ہے اَلْحُبُّ لِلّٰہِ وَمِنْکَ الشَّفَقَۃُ عَلَیْنَا"۔ ولایت مآب مسکرا دیے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ فاطمہؑ کی یہ نورِ نظر علم و فضل کے اعلیٰ منازل طے کر چکی تھی۔

تعلیم کا تو یہ حال تھا۔ رہی تربیت۔ وہ بھی نسوانیت کے بہترین اصول سے عمل میں آئی۔ چنانچہ جب وقت جنابِ فاطمہ زہراؑ کا انتقال ہوا، اس وقت جنابِ زینب کی عمر تقریباً پانچ سال کی ہوگی۔ پیدائشی ذکی اور ذہین لڑکیاں اس عمر میں بھی اچھی خاصی باتمیز ہو جاتی ہیں اور مینا سی بولنے لگتی ہیں۔ خاص کر گھر کی بڑی بوڑھی کی تربیت کا اثر لینے لگتی ہیں۔ اور بہت جلد دسوں انگلیاں دسوں چراغ کا مصداق ہو جاتی ہیں۔ اگرچہ کم سنی میں خانہ داری کی الجھنوں میں

بہت زیادہ نہیں پڑتیں۔ لیکن آیندہ زندگی کا ایک دُھندلا سا خاکہ اُن کے ذہن نشین ہونے لگتا ہے۔ اِس کا ثبوت یہ ہے کہ جب گھر بار سنبھالنے کی اپنی باری آتی ہے تو اُس وقت کو یاد کرکے۔ عید، بکرید، شادی بیاہ کے موقع پر اکثر شوہر کو سُنا دیتی ہیں" اللہ بخشے جو کچھ میں نے اپنی اماں کو کرتے دیکھا ہے اپنی زندگی تک تو میں بھی وہی کرونگی۔ میرے بعد چاہے جو کچھ ہوتا رہے یہ بات وہ ہے جو کُنبے میں ہوئی ہے"۔

قانونِ تمدن کے اعتبار سے مردوں کے معاملات کو چھوڑکے ایک بھرے پُرے گھر کی عزت اُس خاندان کی بڑی بوڑھی کے دم سے وابستہ ہوتی ہے۔ اور وہ بال بچے والی ماں کی ذات ہے۔ ایک سنجیدہ اور نیک بی بی اپنے گھر کی چار دیواری میں اچھی خاصی چاند بی بی ہوتی ہے۔ اور قریبی تعلقات کے اعتبار سے اپنی محبت کی دُنیا کے رہنے والوں پر بے لاگ حکومت کرتی ہے۔ ماں باپ، ساس، سُسرے اگر اتفاق سے زندہ ہیں اور معذور علیل ہیں یا صاحبِ فراش۔ تو اُن کی محبت میٹھی میٹھی ہلکی سی

ہو کے رہ جاتی ہے، جس کی طرف خاص توجہ کی ضرورت نہیں ہوتی۔ اُن کا زندہ ہی رہنا غنیمت سمجھیئے۔ لیکن چلتے پھرتے محبت کے مجسمے بھائی بھاوج، نند نندوئی، جیٹھ جٹھانی، دیور دیورانی ہیں ان سب کے ساتھ ایک گھر کی خاتون کو تعلقاتِ محبت قایم رکھنے کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ یہ اُس صورت میں کہ حُسنِ اتفاق سے سب ایک ہی جگہ رہتے ہوں۔ اگر نند جٹھانی بھی اللہ رکھے وہیں موجود ہیں، تو گھر کی بی بی کے لیے اُن کے رکھ رکھاؤ کا معاملہ ایک سخت الجبرے کا سوال حل کرنے سے کم مشکل نہیں۔ خیر۔ ان دونوں سے تو کسی طرح نبٹ جاتی ہے۔ لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ نیک طبیعت بی بیوں کو چھوڑ کے۔ آخر میں ذکر کی ہوئی بی بی (دیورانی) کا معاملہ بڑا ٹیڑھا ہوتا ہے۔ بعض اوقات دیکھا گیا ہے کہ گھر میں یہی ذاتِ شریف جنگ و جدل کی غضبناک دیوی بن جاتی ہے اور شیرازۂ محبت بکھر جاتا ہے۔ یہیں گھر کی بڑی بوڑھی کی عقلمندی۔ ادا شناسی اور تدبیرِ منزل کا پتہ چلتا ہے۔ اگر اُس کے برتاؤ سے سب خوش ہیں، تو گھر رشکِ جنت۔ اگر ناراض،

تو میدانِ قیامت سے بدتر!

اگر خلافِ ادب نہو آیئے، ذرا اہلِ بیتِ رسولؐ کا جائزہ بھی لیتے چلیں، اور مردوں کو چھوڑ کے محترم خواتین کے طرزِ تمدن پر نظر ڈالیں۔ قیاس تو یہ کہتا ہے کہ لاکھ جہان بنان کی جائے اُن کے حرکات و سکنات اور اقوال و افعال کی حرف گیری طاقتِ بشری سے باہر ہے۔ کیونکہ وہ گھر تو زنانِ اُمت کے لیے حسین تمدن کی مثال تھا۔

بازارِ مصر میں چل یوسف کا سامنا کر کھوٹے کھرے کا پردہ کھل جائیگا چلیں میں

اللہ کی مقبول ترین بندیاں

اسلام کے اربابِ خبر متفق ہیں کہ بقولِ رسالتمآبؐ اِنَّ اللّٰہ اختار مِنَ النِّسَآءِ اَرْبَعَۃً مریم بنتِ عمران، آسیہ بنتِ مزاحم۔ خدیجہ بنت خویلد۔ فاطمہ بنت محمدؐ۔ ان چار بی بیوں کا رتبہ اللہ کے نزدیک تمام عالم کی عورتوں سے زیادہ ہے (اس قسم کی ایک حدیث بی بی عائشہ سے بھی مروی ہے)

حضرتِ مریمؑ۔ اس وجہ سے بہشتِ خداوندِ عالم

صاحبِ عزّت ہیں کہ اُن کے بطنِ مبارک سے جنابِ عیسیٰؑ روح اللہ پیدا ہوئے (وَنَفَخْتُ فِیْہِ مِنْ رُّوْحِیْ)
حضرت آسیہؑ بنت مزاحم (زوجۂ فرعون) اس سبب سے مقبولِ خدا تعالیٰ ہوئیں کہ وہ مادی حیثیت سے حفظِ نبوّت کا سبب قرار دی گئی تھیں۔ حضرت موسیٰؑ کے لیے اُنکی آغوش، ماں کی گود بن گئی تھی کہ بڑے بڑے نازک موقعوں پر اُن جناب کو فرعون کی تیغِ ظلم سے بچایا۔ اگر وہ نہ ہوتیں تو کیا ہوتا؟
حضرت خدیجہؑ بنتِ خویلد۔ (زوجۂ رسالتمآبؐ) اس وجہ سے منظورِ نظرِ باری ہوئیں کہ اُس کے آخری محبوب کی محبوبہ تھیں۔ دوسرے یہ کہ اُنھوں نے اپنی تمام دولت ترقیٔ اسلام کے لیے وقف کر دی تھی۔ رسولؐ کے مصائب میں بھی کچھ دن شریک رہیں۔ تیسرے یہ کہ اُن کے بطنِ مبارک سے جنابِ فاطمہؑ ایسی بی بی پیدا ہوئیں، جن کو سیدۂ عالم کہتے ہیں۔
حضرت فاطمہؑ (بنت محمدؐ) آفتابِ رسالت کی روشنی، ماہتابِ امامت کی ہمدوش، حسنؑ و حسینؑ، زینبؑ و ام کلثومؑ

رقیہ و محسن کی والدہ۔ صاحب آیۂ تطہیر اِنَّمَا یُرِیْدُ اللّٰہُ لِیُذْھِبَ عَنْکُمُ الرِّجْسَ اَھْلَ الْبَیْتِ وَیُطَھِّرَکُمْ تَطْھِیْرًا۔ (اللہ کے نزدیک وہ اور اُن کے بچے پاک اور پاکیزہ ہیں۔)

مجھے انھیں خاتون محترمہ کو دیکھنا ہے کہ خاندان کے چھوٹے بڑوں سے اُن کا کیا برتاؤ تھا۔ اُمت کے لوگ اُن کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ گھر کے مختلف معاملات میں اُن کا کیا رویّہ تھا۔ اور خانہ داری کی کیا حیثیت تھی۔ اس وجہ سے کہ ہمیں جنابِ زینبؑ کو انھیں معصومہ کے دامنِ تربیت اور کردارِ حسنہ کی روشنی میں دیکھنا ہے۔

مشہور ہے کہ اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ۔ فرزند ایک کھلا ہوا راز پدر ہوتا ہے۔ اسی طرح اَلْبِنْتُ سِرٌّ لِاُمِّھَا سے قیاس کیا جا سکتا ہے (لڑکی اپنی ماں کا پرتو ہوتی ہے) چونکہ ذکرِ جنابِ فاطمہ مقصودِ تالیف نہیں لہٰذا بخوفِ طوالت مختصراً اُن کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

باپ سے برتاؤ

رسالت مآبؐ اپنی نیک بیٹی سے بےحد خوش تھے کہ

جب مسجد میں تشریف لاتی تھیں تو سرو قد تعظیم کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ متعدد احادیثِ رسولؐ اُن کی فضیلت و شرف کی سند ہیں۔ اسی طرح جنابِ زینبؑ نے اطاعت و احترام علی بن ابی طالب میں کوئی دقیقہ باقی نہیں رکھا۔ اور وہ جناب بھی اپنی پیاری بیٹی سے بے انتہا محبت رکھتے تھے۔

شوہر سے برتاؤ

رفاقت علی مرتضیٰ میں تمام زندگی بسر کی۔ فقر و فاقہ میں اُن کی شریک رہیں۔ دوسری عورت ہوتی تو برقع سنبھال کے اُٹھ کھڑی ہوتی اور کہتی: "بندی کا سلام لیجیے بس اب خانہ آباد دولت زیادہ"۔ مگر یہاں تو کچھ اور ہی عالم تھا۔ نورانی ذاتوں سے گھر آباد۔ دولت معرفت سے دلوں کے خزانے معمور۔ فاطمہؑ ایسی جامع الصفات ہستی نے تو شرف علی مرتضیٰ میں چار چاند لگا دیے تھے۔ شوہر و زوجہ کی محنت سے جو اکلِ حلال میسر ہوتا تھا صبر و شکر کر کے زندگی بسر ہوتی تھی۔

سید بن طاؤس نے جو احادیثِ رسولؐ کے ثقاتِ رجال میں شمار کیے جاتے ہیں، ایک روایت قلمبند کی ہے کہ ایک روز

علی بن ابی طالب مسجد سے گھر میں تشریف لائے۔ شدت
فاقہ سے قدم لڑکھڑا رہے تھے جناب فاطمہ سے پوچھا
کچھ کھانے کو ہے۔ انھوں نے نفی میں جواب دیا۔ آنجناب
نے کہا: ؎

شمشیر
دو رہن کو یا اپنی ردا یا مری شمشیر

کڑے کنگن کہاں دھرے تھے جو گرد میں رکھ دیے جاتے۔
لے دیکے چکی تھی یا چادر، زرہ تھی یا شمشیر دو پیکر اور راہِ
خدا پر جہاد کرنے والے کا گھر۔ فاطمہ کو گوارا نہ ہوا کہ اس
عرب کے سورما کی پیٹھ بے تلوار کے خالی پڑا رہے! اگر گلدستۂ مسجد
سے حیّ علی الجہاد کی اچانک آواز آگئی تو کیا ہوگا؟
(انیس مغفور نے الفاظِ مناسب میں یہ واقعہ یوں نظم کیا ہے:)

زہرا نے کہا تیغ میں دوں رہن کو کیونکر
اعدا سے جہاد آپ کیا کرتے ہیں اکثر
لیجائیے حاضر ہے یہ سر کی مرے چادر
زہرا سے ردا لے کے چلے حیدرِ صفدر
فاقے سے نہ غمگیں تھے نہ عسرت کا گلا تھا
ہر گام پہ تسبیح تھی اور ذکرِ خدا تھا

فاعدہ ہے کہ بچوں کے کپڑے عید بقرعید کے لیے مقدرت سے زیادہ قیمتی بنا دیے جاتے ہیں، جو اکثر اوقات والدین کی ضرورت کے وقت رہن بھی کر دیے جاتے ہیں۔ مگر وہاں تو بقولِ انیسؔ حسنینؑ کا یہ عالم تھا کہ:

کرتے کبھی ثابت نہیں دیکھے بدنوں میں
یہ چاند سے پھرتے تھے پھٹے پیرہنوں میں

فقر و تنگدستی کی یہ حالت۔ نصرتِ اسلام کا یہ جذبہ۔ دولتِ قناعت کے یہ خزانے بھلا کس کو میسر ہوسکے؟
جنابِ فاطمہؑ نے محترم شوہر کی آواز پر کبھی آواز بلند نہیں کی۔ اگر کوئی شکایت ہوئی تو اُسے بھی ایک رازِ معصومیت سمجھیے۔ جس کا علم سوائے رسولؐ کے اور کسی کو نہیں ہوتا تھا۔ بلکہ بعض اوقات گوشِ رسولؐ بھی اُس سے آشنا نہ ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک روز کا واقعہ ہے کہ رسول اللہؐ خانۂ فاطمہؑ میں تشریف لائے۔ (نہ معلوم بلائے ہوئے یا باقتضائے محبت) بیٹیؑ کی صورت دیکھ کے کچھ تاڑ گئے پوچھا: "علیؑ کہاں ہیں؟" جواب ملا۔ "بابا معلوم نہیں۔ آنحضرتؐ تلاش کرتے ہوئے باہر نکل کھڑے ہوئے۔ حتیٰ کہ فرش

زمین پر مسجد میں آرام کرتے ہوئے پایا۔ اس طرح کہ کروٹیں بدلنے میں جسمِ مبارک کچھ خاک آلود ہو گیا تھا۔ مسکرا کے فرمایا: "قُم یا ابا تراب"۔ پھر اپنے ہمراہ گھر لے آئے۔ گویا کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ اسلام نے خاندانی یا ازدواجی بدمزگیوں کو سدھارنے کا ذریعہ بزرگوں کو قرار دیا ہے۔ اگر اس پر بھی عملدرآمد ہوتا رہے تو ہزاروں قسم کی تباہیوں کا سدِّباب ہو جائے۔

انھیں بے نظیر تعلقات کی بنا پر بعدِ وفات جنابِ فاطمہؑ علی مرتضیٰؑ زندگی بھر یاد کرکے رویا کیے۔ ذیل میں اُس درد انگیز مرثیے کے اشعار درج کیے جاتے ہیں جو بعدِ دفن جناب فاطمہؑ علی بن ابی طالب نے وحشت انگیز گھر کو دیکھ کے نظم فرمائے تھے۔

أرى عِلَلَ الدنيا عليَّ كثيرةً وصاحبُها حتى المماتِ عليلُ
وإنّ افتقادي فاطماً بعدَ أحمدٍ دليلٌ على أن لا يدومَ خليلُ

ترجمہ: میں دیکھتا ہوں کہ مصائب کی ایک دنیا مجھ پر ٹوٹ پڑی ہے جن سے مرتے دم تک مجھے چھٹکارا نصیب نہیں ہو سکتا

(وفاتِ رسول کے بعد فاطمہؑ کی جُدائی نے ثابت کر دیا کہ سچی محبت کرنے والا ہمیشہ زندہ نہیں رہتا۔)

حضرت جعفر بن محمدؑ سے مروی ہے کہ وفاتِ جنابِ فاطمہؑ کے بعد علیؑ مرتضیٰ روزانہ اُن کی قبرِ مطہر پر تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ایک روز بحیثیتِ غم میں لحد پر سر رکھ کے فرمانے لگے:

مالی مررتُ علی القبور مسلّماً ۔ قبرَ الحبیب ولم یرد جوابی

یا قبرُ مالک لا تجیبُ منادیا ۔ أمللتَ بعدی خلّۃَ الاحباب

"یہ مجھ پر کیا مصیبت ہے کہ جب میں قبرستان سے اپنے دوست کی قبر پر سلام کرتا ہوا گزرا تو اُس نے جوابِ سلام تک نہیں دیا۔"

"اے قبر تجھے کیا ہو گیا۔ کہ پکارنے والے کو جواب نہیں دیتی، کیا میرے جانے کے بعد تو نے میرے دوستِ صادق کو مجھ سے برگشتہ کر دیا۔"

بقیع کے ایک گوشے سے آواز آئی نہ معلوم کس کی تھی:

قال الحبیبُ کیف لی بجوابکم ۔ وانا رھینُ جنادلٍ وتراب

اکل الترابُ محاسنی فنسیتُکم ۔ وحُجبتُ عن اھلی واترابی

فَعَلَیکُمْ مِنِّی السَّلَامُ تَقَطَّعَتْ مِنِّی وَ مِنْکُمْ خُلَّۃُ الْاَحْبَابِ

دوست نے کہا: "یہ تو سوچو! میں تمھیں کیونکر جواب دوں۔ دراں حالیکہ ہم مرنے والے پتھروں اور ڈھیروں مٹی کے نیچے دبے پڑے ہیں ہستی کی تمام خوبیاں خاک میں مل گئیں۔ بس تم کو ہم بھول گئے۔ اور اعزّا و احباب سے روپوش ہو گئے۔ اب سلام قبول کرو۔ کیونکہ باہمی رشتۂ الفت منقطع ہو چکا"۔

قاعدہ ہے کہ اگر کسی بی بی نے شوہر سے زندگی میں اچھا سلوک کیا تو اُس کی یاد ہمیشہ رہتی ہے۔ اگر اس کے خلاف ہوا تو خیر رسمی طور سے سب کچھ کر دیا جاتا ہے۔

اسی طرح عبداللہ ابنِ جعفر کو جناب زینب کے حسنِ سلوک پہ بجا فخر تھا۔

خانہ داری میں انکا کام اور اولاد کی دیکھ بھال

یوں تو اس پاک گھر والوں کا بیشتر وقت عبادت و ریاضتِ خداوندی میں صرف ہوتا تھا۔ لیکن خانہ داری کی ضروریات خصوصاً جناب فاطمہؑ کا کچھ زیادہ وقت لے لیا کرتی تھیں۔ کبھی چرخہ لیکے بیٹھ گئیں اور تھوڑا سا سوت کات لیا یا ایک چکی بھی تھی؛ جو کبھی چلی، کبھی نہیں۔ دوسرے چولھا جو کبھی گرم ہوا

کبھی ٹھنڈا پڑا رہا۔ پھر جو کچھ ان دونوں کے استعمال سے حاصل ہوتا، تو گویا مساکینِ مدینہ کی مرادیں بر آتیں اور گھر والے تسبیحِ شکر پڑھ کے سو رہتے۔ ملی تو روزی نہیں تو روزہ۔

اس زمانے میں بھی سلامتی سے ہر گھر کی بی بی امورِ خانہ داری میں مصروف رہتی ہے (چکی پیسنا تو پرانا دستور تھا اس کا کیا ذکر) اگر کسی نے پینے پہننے اوڑھنے میں اتفاق سے کسی شئے کی کمی ہو گئی تو بیگم صاحبہ کی ناک بھوں چڑھ جاتی ہے۔ رہا چرخہ، تو یہ کاتا کوتی، آجکل کے بیگماتی تمدن سے خارج ہے۔ ہاں، تیلیوں اور قرتیبہ سے بے شک گھر کی چھوٹی بڑی بیگم شغل فرما لیا کرتی ہیں۔ لیکن موٹی جھوٹی سوتی بچھی کس شمار قطار میں، اُس کے کھُرکھُرے دھاگے سے تو چٹکیاں چھل جاتی ہیں۔ ہاں نرم ولائتی اون کی لچھیاں ہوں تو کیا کہنا۔ اگر وہ بھی موجود سہی، تو ایک سوئٹر یا بنیان کی تیاری آندھی روگ ہو جاتی ہے۔ آج جی نہیں چاہتا ہے سر دکھتا ہے۔ چلو چھٹی ہوئی۔

اب پرورش اولاد کی طرف آئیے، اور صرف ذیل کے واقعے سے نتیجہ نکال لیجیے۔ کہاں تک قلم لوگوں۔

یہ واقعہ لکھنا ہی پڑتا ہے کہ: ایک روز جناب بلالؓ (موذنِ رسولؐ) نمازِ صبح کے لیے مسجد میں دیر کر کے پہنچے۔ حضرت نے فرمایا: "ہائیں بلال کہاں تھے؟" بلالؓ نے عرض کی: "یا رسول اللہ میں گھر سے تو ٹھیک وقت پر چلا تھا، لیکن آپ کی نورِ نظر کے دروازے سے جو گزرا تو میں نے سنا کہ چکی کی آواز کے ساتھ ساتھ شہزادے کے رونے کی آواز بھی آ رہی ہے۔ خادمِ بتولؑ تو ہوں ہی۔ دروازہ کھٹکھٹانے لگا۔ آواز آئی: "آؤ بلال"۔ اندر پہنچا تو کیا دیکھتا ہوں کہ میری شاہزادی ایک ہاتھ سے چکی پیس رہی ہیں، اور دوسرے ہاتھ سے اپنے لختِ جگر کو پہلو پر رکھے ہوئے ہیں۔ میں نے عرض کی: "لائیے میں آپ کا کام بنا لوں، اجازت دیجیے، یا تو چکی پیسوں یا شہزادے کو میری گود میں دیدیجیے تاکہ اُس وقت تک بہلاؤں جب تک آپ چکی سے فارغ ہوں۔ معصومہؑ نے فرمایا: "بلال اگر تمھیں اصرار ہے، تو خیر۔ لو چکی پیس دو۔ میں اپنے لال کو خود بہلا کے خاموش کر لوں گی"۔ یہ ماجرا سُنا، تو رسول اللہ آبدیدہ ہو کے رہ گئے۔ فرمایا: "

یا بلال جزاک اللہ خیرا۔

یہ تھا غریب گھر کی ضروریات پوری کرنے میں اُس بی بی کا انہماک۔ اور یہ تھی پرورش اولاد کی جانب توجہ۔ راحت کا تو کیا ذکر (باپ سے لونڈی خرید دینے کا سوال کیا تو تسبیح کی برکت ملی) ہے تو یہ کہ زندگی بھر دُکھ ہی کو سُکھ سمجھیں۔ اُس نیک بی بی پر اللہ کی لاکھوں رحمتیں! فاطمہؑ کی ذات زنانِ اسلام کے لیے وہ کسوٹی ہے، جس کے ذریعے سے وہ اپنے افعال و کردار ہر وقت پرکھ سکتی ہیں۔

اصل تو یہ ہے کہ جس طرح خمسۂ نجبا (پنجتن پاک) محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ، حسینؑ ہیں۔ اسی طرح خاندانِ رسالت کی پانچ بی بیاں خمسۂ نجبات (پنج زنانِ پاک) کہلائے جانے کی مستحق ہیں۔

حضرتِ آمنہ (مادرِ محترمۂ رسولؐ) حضرت خدیجہ بنت خویلد (زوجۂ آنحضرتؐ) حضرت فاطمہ بنت اسد (مادرِ مکرمۂ حضرت علیؑ) حضرت فاطمہؑ (بنتِ رسول اللہ) حضرت زینبؑ (بنتِ علیؑ) پنجتن پاک کے فضائل کی طرح ان میں سے ہر معصومہ کے فضائل سے اسلامی

کتابیں بھری پڑی ہیں۔

قولِ امام رازیؒ

فخرالدین رازیؒ لکھتے ہیں کہ اہل بیتؑ رسولؐ کے ساتھ پانچ چیزوں میں برابر ہیں: "نماز میں تشہد کے وقت دونوں پر صلوٰۃ بھیجی جاتی ہے۔ دونوں پر سلام بھیجا جاتا ہے۔ دونوں کی ذاتیں طہارت کی حامل ہیں۔ صدقہ دونوں پر حرام ہے دونوں کی محبت لازم و ملزوم

کُنبے قبیلے والوں سے برتاؤ

عمدہ عزیزانہ معاشرت کی نشانی یہ ہے کہ بڑے بوڑھے شفقت کریں۔ چھوٹے عزت سے پیش آئیں، اور برابر والے محبت سے پیش آئیں۔ خاص کر عورتوں کا جذباتی رشتہ بڑا نازک ہوتا ہے۔ بڑی خوش قسمت ہے وہ بی بی جس سے ہر طبقے کے عزیز خوش رہیں۔ جناب فاطمہؑ نے اپنی زندگی میں کسی عزیز کو ناراض ہونے کا موقع نہیں دیا۔ کُنبے کے بڑے چھوٹے۔ مرد اور عورتیں سب اُن کے برتاؤ سے خوش رہیں، بلکہ اُن کی ہستی غنیمت سمجھی جاتی تھی۔ اُن کی قایم مقام جناب زینبؑ نے بھی خاندان میں اسی

رشتۂ محبت و یگانگی کو ایسا قائم رکھا، جس کی نظیر مشکل سے ملے گی۔ ازواجِ رسولؐ میں حضرت ام سلمہؓ تو جناب فاطمہؑ اور اُن کے بچوں کی عاشق ہی تھیں۔ اس گھر میں بزرگ کی حیثیت سے رہیں اور یہیں انتقال فرمایا۔ البتہ جناب عائشہؓ سے رسول اللہؐ کے بعد فوراً ہی بدمزگی کے آثار پیدا ہوگئے اور مختلف وجوہ سے اُن کی زندگی کے آخر وقت تک کھٹ پٹ رہی۔ یہاں تک کہ لوگوں نے علیؑ مرتضیٰ سے جنگ کرادی جو (جنگِ جمل) کے نام سے مشہور ہے۔

صاحبِ غُررُ والدُّرر نے لکھا ہے کہ جس وقت جنابِ عائشہؓ کے اونٹ کے گرداگرد سخت جنگ ہو رہی تھی اور کسی طرح ختم ہی نہیں ہوتی تھی تو علیؑ مرتضیٰ نے حکم دیا کہ اونٹ کی کونچیں کاٹ دو۔ کسی نے بڑھ کے تلوار کا ایک ہاتھ مارا اور اونٹ گرا، اُس وقت کسی نے چلّا کے کہا ذَا رقبُوا اللّٰہ فی حرمۃ رسولِ اللّٰہ (مسلمانو! خدا کا خوف کرو۔ زوجۂ رسولؐ کی بے حرمتی نہ ہوجائے) یہ آواز سُنتے ہی علیؑ مرتضیٰ نے بیتاب ہو کے اپنے فرزند امام حسنؑ سے کہا: یا بُنَیَّ هَلَکتُ (بیٹا غضب ہو گیا) امام حسنؑ نے عرض کی

قَدْ نَهَیْتُكَ عَنْ مَسِیْرِكَ (میں نے تو آپ کو یہاں تشریف لانے سے پہلے ہی منع کیا تھا) علیؑ مرتضیٰؑ نے فرمایا: لَمْ اَدْرِیْ اَنَّ الْاَمْرَ یَصِلُ اِلٰی هٰذَا (مجھے کیا معلوم تھا کہ یہ نوبت یہاں تک پہنچ جائے گی) اُس پر بھی جناب عائشہؓ کے حقیقی بھائی محمد ابن ابی بکرؓ جو علیؑ مرتضیٰ کی طرف سے لڑ رہے تھے حکم دیا کہ جا کے بہن کی تسلی تشفی کرو۔ وہ آئے اور بہن کو ساتھ لے کے بصرے چلے گئے۔

دیکھنا یہ ہے کہ اُس وقت جبکہ شکست خوردہ زوجۂ رسول علیؑ مرتضیٰؑ کے رحم وکرم پر تھیں آنجناب نہایت عزت واحترام سے پیش آئے۔ اور اپنے فرزندوں کے ہمراہ نہایت آرام و آسایش سے مدینہ روانہ کر دیا۔

خلاصہ یہ کہ جناب فاطمہؑ کے وقت میں اور اُن کے بعد بھی جناب زینبؑ کے تعلقات کنبے قبیلے کے مردوں اور عورتوں سے خوشگوار تھے۔ آلِ عباس۔ جناب عقیل کا گھرانا، جناب جعفر کے سلسلے والے سبھی موجود تھے اور اہلبیت سے شیر و شکر، بلکہ آخر الذکر خاندان تو اُن کی سسرال ہی تھا رسول اللہؐ کے انتقال کے وقت جناب زینبؑ کا

سنِ شریف تقریباً پانچ سال کا ہوگا۔ اور یہ پہلی مصیبت تھی، جو بچپنے میں اُن معصومہ پر نازل ہوئی۔ لیکن وفات آنحضرت کے چھ یا نو ماہ بعد زینبؑ کے سر پر مصیبت کا ایک پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ یعنی جنابِ فاطمہؑ الیسی فدائی ماں سے ہمیشہ کے لیے چھوٹ گئیں۔

سوتیلی ماں

مرنے والی جنتی بی بی نے زینبؑ کی کم سنی اور خانہ داری کی ذمہ داریوں کا احساس اپنی زندگی ہی میں کرلیا تھا۔ کہ بچی کیا کیا کرے گی، کیونکر پورا گھر سنبھالے گی۔ لہذا علیؑ مرتضیٰ سے وصیّت فرمادی تھی کہ میرے بعد میری بھانجی اُمامہؑ (بنتِ زینب بنتِ رسولؐ) سے عقد کرلینا، تاکہ بچوں کی پرورش اور دیکھ بھال اچھی طرح ہوسکے۔ چنانچہ حسبِ وصیت جنابِ فاطمہؑ علیؑ مرتضیٰ نے ویسا ہی کیا۔

وقتِ عقد جنابِ اُمامہ کی عمر تقریباً پندرہ سال کی ہوگی۔ یہ محترمہ نہایت عابدہ زاہدہ اور سگھڑ بی بی تھیں۔ اپنی خالہ جنابِ فاطمہؑ سے بے حد محبت کرتی تھیں۔ دوسرے یہ کہ اُن کے متعلق لکھا ہے کہ خود رسولِ خداؐ عہدِ شیر خواری میں

اُن سے بہت مانوس تھے، حتیٰ کہ حالتِ نماز میں جس وقت قیام فرماتے تھے تو پیاری پیاری اُمامہ کو اپنے کاندھے پر بٹھا لیتے، جب رکوع فرماتے تو بٹھا دیتے، اور بعدِ سجدہ پھر کاندھے پر سوار کر لیتے تھے۔

ان محترمہ نے بعدِ جنابِ فاطمہؑ ایسا گھر سنبھالا کہ باید و شاید۔ خالہ کی اولاد کو اپنی اولاد کی طرح پالا۔ ورنہ سوتیلی ماں، معاذ اللہ! بچوں کی زندگی اجیرن ہو جاتی، اور باپ بیچارہ مجبور۔

یہ مسلّم قانونِ الٰہی ہے۔ کہیں بچوں کے سر سے باپ کا سایہ اُٹھ جاتا ہے۔ کہیں آغوشِ مادر سے جدائی ہو جاتی ہے لیکن خدانخواستہ اگر کسی کے بچوں کو سوتیلی ماں سے سابقہ پڑے تو اللہ جنابِ اُمامہ کی سی دوسری ماں دے۔ جن سے اولادِ علیؑ کو حقیقی ماں کا مزہ آ گیا۔

جنابِ اُمامہ شہادتِ علیؑ مرتضیٰؑ تک کوفے میں خوش و خرم رہیں۔ اُن سے ایک صاحبزادے محمد الاوسط بھی پیدا ہوئے۔ اور حسبِ وصیت آنجناب بعد کو مغیرہ بن نوفل (حضرت عبد المطلب کے پر پوتے) سے عقدِ ثانی

کرلیا۔ افسوس ہے کہ آج پیروئ علی بن ابی طالبؑ کے مدعی عقدِ بیوگاں کو خاندان کے لیے کلنگ کا ٹیکا سمجھتے ہیں جسکی آڑ میں مختلف اغراض دنیوی کارفرما ہوتے ہیں۔

سوءِ اتفاق سے تو میں نہیں کہوں گا، ہاں حسنِ اتفاق سے جناب زینبؑ کی کبھی کی سوتیلی ماں ہر پھر کے سوَت کی مسند پر آ بیٹھیں۔ یعنی مغیرہ بن نوفل کی وفات کے بعد عبداللہ بن جعفر (شوہر جناب زینبؑ) نے امامہ سے عقد کر لیا۔ اور ایک ہی گھر میں دونوں رہنے لگیں۔ مگر باوجودِ کوشش نظر سے نہیں گزرا کہ ان دونوں خاتونوں کے تعلقات ایک دوسری سے کبھی کشیدہ ہوئے ہوں۔

عقدِ زینبؑ عبداللہ بن جعفر سے

بحوالہ تذکرہ ابنِ جوزی، جناب زینبؑ کبریٰ۔ امّ الحسن بنتِ فاطمہؑ کا عقد علی بن ابی طالبؑ نے اپنے بھتیجے عبداللہ بن جعفر طیار کے ساتھ کر دیا۔ جن کا حسب و نسب تعریف سے بے نیاز ہے۔ عبداللہ اول تو رسالتمآبؐ کے چچا زاد بھائی جعفرِ طیار کے فرزند تھے جنکے متعلق متفق علیہ حدیثِ نبوی ہے اَشْبَهْتَ خَلْقِيْ وَخُلُقِيْ (جعفر! تم مجھ سے صورتاً اور سیرتاً

دونوں طرح مشابہ ہو) دوسرے حضرتِ جعفر نے جو وفاداری
اور اسلام پروری کی ہے، اُس کا خلاصہ یہ ہے کہ اول بحکمِ
رسولؐ مکے سے ملکِ حبشہ ہجرت فرما گئے تھے۔ نجاشی شاہِ حبش
اور اُس کی بہت سی رعایا نے انھیں کی وجہ سے اسلام قبول
کیا تھا۔ اُن کا لقب ذوالہجرتین تھا۔ یعنی پہلے حبشہ گئے اور
پھر وہاں سے مدینے تشریف لائے۔ دوسرا ذوالجناحین
(بقولِ رسولؐ اُن کو جنت میں دو پر عنایت ہوئے)

سنہ ہجری میں، جب فتح خیبر کی خوشی تازی تھی، جنابِ
جعفر ملکِ حبشہ سے مدینے تشریف لائے۔ رسول اللہؐ نے
استقبالِ جعفر کیا، گلے سے لگایا اور فرمایا: "لا ادری بایھما
افرح بقدوم جعفر ام بفتح خیبر؟" (کونسی خوشی میں زیادہ
مناؤں، جعفر کے آنے کی یا فتح خیبر کی؟)

بہادری کا یہ عالم تھا کہ غزوۂ موتہ کے لیے رسولؐ
نے لشکرِ اسلام کا سردار بنا کے بھیجا۔ اُس طرف سے شرحبیل
ایک کثیر تعداد لشکر کے ہمراہ مقابلے کے لیے آیا۔ لشکرِ اسلام
کی تعداد بہت کم تھی۔ جنابِ جعفر نے سوچا ایسا نہو کہ مسلمان
کثرتِ مخالفین سے مرعوب ہو کے بددل ہو جائیں۔ لہذا

اپنے گھوڑے کی کوچیں کاٹ ڈالیں اور پیادہ ہو گئے۔ اللہ اللہ! عزتِ اسلام کا کیا خیال تھا؟ (تاریخ جنگِ اسلام میں یہ پہلا گھوڑا تھا جو عقر کیا گیا) مقصد یہ تھا کہ موت و زیست میں ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جنابِ جعفر کی اس روش نے لشکرِ اسلام میں شجاعت کی روح پھونک دی۔ پھر ایسے جم کے لڑے کہ دشمنوں کے پیر اکھڑ گئے۔ گو اس یادگارِ خونیں معرکے میں زید بن حارث، اور خود جنابِ جعفر اور عبداللہ ابن رواحہ ایسے علمدار شہید ہوئے لیکن آخرِ کار خالد بن ولید کی تلوار نے فتح اسلام کا ڈنکا بجوا دیا۔

ابن جوزی ابوہریرہؓ کی سند سے لکھتے ہیں کہ رسولِ خداؐ جعفرِ طیار کو اُن کی غربا پروری کے سبب سے "ابوالمساکین" کہہ کے پکارتے تھے، اور فرماتے تھے: "خیرُ النّاسِ حمزہؓ وجعفرؓ وعلیؑ"۔

اولادِ جعفر پر شفقتِ رسولؐ

گزشتہ مورخ لکھتا ہے کہ ماتمِ جنابِ جعفر کے تین روز بعد رسالت مآبؐ اُن کے گھر تشریف لائے، اور جنابِ اسماءؓ بیوہ جنابِ جعفر سے فرمایا: بھائی جعفر کے بچوں کو

میرے پاس بلاؤ۔ لہذا تینوں صاحبزادے محمدؓ عونؓ عبداللہؓ حاضر ہوئے۔

محمدؓ کے سر پر دستِ شفقت پھیر کے فرمایا: "یہ بچہ اپنے چچا ابوطالب سے مشابہ ہے"۔ عونؓ کے متعلق فرمایا: یہ فرزند صورتاً اور سیرتاً مجھ سے مشابہ ہے۔ اب عبداللہ ابن جعفر کا ہاتھ اپنے دستِ مبارک میں لیا اور فرمایا: "یا اللہ جعفر کا بہتر قائم مقام اُن کے اہل کو عنایت فرما، اور عبداللہ کی قوتِ بازو کی کمائی میں برکت دے۔" جب بچوں کی ماں کو خاموش پایا، تو فرمایا "اتخافین علیهم العیلة وانا ولیهم فی الدنیا والاخرة۔" (اسماء تم کچھ فکر نہ کرو، یہ بچے بھٹکے حالوں نہیں رہ سکتے۔ میں دونوں جہان میں ان کا ولی ہوں) حتیٰ کہ جب عبداللہ بن جعفر پر رسولؐ کی نظر پڑتی تھی تو فرماتے تھے: "السلام علیک یا ابن ذی الجناحین" (بخاری)

دعائے رسولؐ کی برکت

صاحبِ ناسخ التواریخ معجزاتِ رسولؐ کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے عبداللہ بن جعفر کے حق میں

یہ دعاے خیر فرمائی تھی: "اللّٰھُمَّ بَارِکْ فِی صَفْقَۃِ یَمِیْنِہٖ" (بارِ الٰہا عبداللہ کی قوّتِ بازو کی کمائی میں برکت عطا فرما) ابوالفرج کتاب اغانی میں اسی دعاے رسولؐ کے سلسلے میں لکھتے ہیں کہ صغرسنی میں عبداللہ نے گیلی مٹی سے ایک اونٹ بنایا، جیسا بچوں کا قاعدہ ہے۔ اتفاق سے رسول اللہؐ ادھر سے گذرے۔ پوچھا: "بیٹے اسے کیا کروگے" بولے "فروخت کروں گا۔ دریافت فرمایا "قیمت کا کیا کروگے"۔ جواب دیا: "کھجوریں خریدوں گا"۔ سرورِ دوعالم نے یہ سُن کے اوپر ذکر کی ہوئی عبداللہ کے حق میں دعا فرمائی۔ جس کی برکت سے اُن کو ہر معاملے میں کامیابی ہوئی۔ اور اتنی دولت و حشمت اللہ نے دی اور فضیلتِ جود و کرم بخشی کہ سبحان اللہ۔ حتیٰ کہ مدینے والے جب کسی سے قرض لیتے تھے تو ادائگی کا وعدہ یوں کرتے تھے: "جب عبداللہ ہم کو عطا فرمائیں گے تو ہم ادا کردیں گے"۔ اُن کا لقب ہی جواد ہوگیا تھا۔

غرر الخصائص میں عبداللہ ابنِ عمر سے منقول ہے کہ امیر معاویہ بن ابی سفیان (حاکمِ شام) امام حسنؑ، امام حسینؑ

و عبداللہ بن جعفرؓ ہر ایک کو ایک لاکھ چوالیس ہزار روپیہ سالانہ دیا کرتے تھے۔ بعدِ وفات معاویہ بن ابی سفیان امام حسینؑ تو تشریف لے نہیں گئے، لیکن عبداللہ بن جعفرؓ یزید کے پاس گئے اور کہا: "تمہارے والدِ ماجد مجھ کو ایک لاکھ چوالیس ہزار روپیہ سالانہ عنایت کرتے تھے اور صلۂ رحم ادا کرتے تھے"۔ یزید نے جواب دیا: "نعماً وکرامۃً"۔ حکم ہوا کہ "اس کی چوگنی رقم عبداللہ بن جعفر کو دیدی جائے"۔ رقم پا کے یہ تو مدینے روانہ ہو گئے۔ درباریوں میں سے کسی کوتاہ بیں نے یزید کو مخاطب کر کے کہا: "اس ایک فردِ بنی ہاشم کو اور اتنی رقم سالانہ!" یزید تیوری بدل کے بولا: "دیکھ گے (ابے تو کیا جانے) میں نے یہ رقم عبداللہ بن جعفرؓ کو نہیں دی، بلکہ تمام مدینے کے رہنے والوں کو دی ہے۔ اُن کا ہاتھ کھلا ہوا ہے، کہیں یہ رقم باقی رہ سکتی ہے"۔

وہی ہوا، جب یہ مدینے پہنچے تو قرضداروں۔ ضرورتمندوں، اور محتاجوں میں کوڑی کوڑی بھر گئی کہ عبداللہِ جواد لدے پھندے آ گئے۔ اب کیا ہے؟ چاندی! یہ حضرت اچھی طرح دولت سرا میں آرام بھی لینے نہیں پائے تھے کہ

دروازے پر بھیڑ ہو گئی۔ لکھا ہے کہ مہینے کے آخر تک اُس آفتابِ کرم نے ضیا پاشی فرما کے تمام کیسہ ہای زر خالی کر دیے۔

یزید کے خاص پرچہ نویسوں نے اطلاع دی کہ سب مال برابر ہو گیا۔ اُس نے معترضین کو سخاوت عبداللہ کی خبر دے کے اُن کی بھانجی مارنے پر بڑا ڈانٹا پھٹکارا۔

سخاوت جنابِ عبداللہ

مولانا جامی (بہارستان) میں لکھتے ہیں کہ جنابِ عبداللہ سخاوت و کرم میں مشہورِ وقت تھے۔ کسی سفر میں جا رہے تھے۔ راستے میں ایک کھجور کا باغ پڑا۔ سواری سے اُتر پڑے اور باغ میں تشریف لے گئے۔ لوگوں سے گفتگو کی اور اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ دیکھا کہ ایک حبشی غلام باغ کی رکھوالی کر رہا ہے۔ اتنے میں مالک کے گھر سے کھانا آیا جس میں صرف دو روٹیاں تھیں۔ اتفاق سے ایک کتا بھی آ کھڑا ہوا۔ غلام نے ایک روٹی اُس کے سامنے رکھ دی۔ اُس نے کھالی پھر بھی ڈٹا رہا۔ اُس نے دوسری بھی دیدالی۔ جنابِ عبداللہ نے پوچھا: "تمہاری روزانہ غذا کیا ہے؟" اُس نے

جواب دیا: "جو آپ نے دیکھی" ۔ پھر پوچھا: "تم نے اس کتے کو اپنے نفس پر کیوں ترجیح دی کہ خود بھوکے رہے۔" اُس نے جواب دیا ۔ "معلوم ہوتا ہے کہ یہ غریب دور سے سفر کر کے ہماری بستی میں بھوکا پیاسا آیا ہے ۔ مجھے گوارا نہ ہوا کہ میں کھا لوں اور یہ بھوکا رہے ۔ جنابِ عبداللہ نے پوچھا: "پھر تم آج کیا کھاؤ گے۔" وہ بولا "کچھ نہیں، اللہ کے واسطے روزہ رکھو نگا" ۔

یہ سُن کے آنجناب نے اپنے دل میں کہا لوگ تو مجھ کو سخی کہا کرتے تھے ۔ یہ غلام تو مجھ سے بھی زیادہ سخی نکلا ۔ رگ ہاشمی میں جوشِ سخاوت اُومنڈ آیا، نخلستان اور غلام دونوں کو اُن کے مالک سے خرید لیا ۔ اور اُس بندۂ خدا کو آزاد کر کے باغ بھی اُسے مرحمت کر دیا ۔

المختصر جنابِ عبداللہ اور اُن کے دوسرے بھائیوں پر ہمیشہ رسول اللہ کی نظرِ شفقت و کرم رہی ۔ آنحضرت کے انتقال کے بعد اُن کے ساتھ وہی شفقانہ سلوک علی مرتضیٰ نے جاری رکھا ۔

جنابِ عبداللہ کی جب مَسیں بھیگنے لگیں تو تمام نوجوانان

بنی ہاشم میں اُن کے رنگِ صبیح، حسنِ کردار، حشمت، مال اور سخاوتِ بیکراں کے چرچے ہونے لگے اور علی بن ابی طالبؑ نے بھی اور زیادہ خصوصیت کا برتاؤ کرنا شروع کر دیا۔

ادھر جنابِ زینبؑ بھی سیانی ہوئیں اور اپنی ہمجولیوں میں دسوں انگلیاں دسوں چراغ کا مصداق ہو گئیں۔ عبداللہ بن جعفر نے بزرگانِ خاندان مثلاً محمد بن حنفیہ اور عبداللہ بن عباس کے مشورے سے خدمتِ علیؑ مرتضیٰؑ میں جنابِ زینبؑ سے پیامِ عقد دیا۔ چنانچہ اُنھوں نے موافق ارشادِ نبوی اظہارِ رضامندی کر دیا۔

وصیتِ رسولؐ

لکھا ہے کہ ایک روز رسالت مآب کی نظر اولادِ جعفرِ طیار اور اولادِ علی بن ابی طالبؑ پر پڑی۔ ارشاد فرمایا: ہمارے لڑکے لڑکیاں آپس ہی میں کھپیں گی: بَنا تنا لبنیا وبنوخا لبنا تنا۔ اسی حدیث کے مطابق ہمارے سادات کے خاندانوں میں اب تک لڑکے لڑکیاں غیرِ سادات کو نہیں بیاہی جاتیں۔

ہاں! تو امیر المومنین نے درخواستِ جنابِ عبداللہ

منظور کر لی۔ اور کیوں نہ کرتے؟ اول تو گھر کے بڑے بوڑھے حکم ہی دے گئے تھے۔ دوسرے بظاہر اُس وقت جنابِ عبداللہ سے بہتر دوسرا لڑکا خاندانِ بنی ہاشم میں دکھائی نہیں دیتا تھا۔ مسجدِ نبوی میں تو گھی کے چراغ روشن ہوئے ہونگے۔ یا پھر درگاہِ باری میں ایک سجدۂ شکر۔

علیؑ مرتضیٰ کو ایسا ہیرا داماد ملا جس کا ہم پلہ تمام قریش میں کوئی نہ تھا۔ حسنِ ظاہر و باطن دونوں موجود تھے۔ اس کے علاوہ زبردست عالم، علمِ فقہ کے بہترین جاننے والے۔ صحابیِ رسولؐ۔ پھر احادیثِ رسولؐ کے معتبر راویوں اور مفسرینِ قرآن مجید میں اُن کا شمار تھا۔ فصاحت کے متعلق یہ کہ مجالسِ امیر معاویہ و یزید میں جو اُنھوں نے تقریریں اور مناظرے کیے ہیں، وہ زبانِ عربی کے مایۂ ناز ذخیرے ہیں۔ خاص کر جنابِ عبداللہ کا وہ معرکہ آرا خطبہ جو اُنھوں نے حقِ حکمین میں ارشاد فرمایا ہے، اُن کی ذہانت و سیاست کا شاہد ہے۔

تقرر حکمین

مختصر یہ ہے کہ ماہِ صفر ۳۷ھ میں علیؑ مرتضیٰ اور امیر معاویہ

(حاکمِ شام) کے لشکر کے درمیان صفین کے مقام پر گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ لشکرِ معاویہ میں جب شکست کے آثار پیدا ہوگئے اور قریب تھا کہ اہلِ شام بھاگ نکلیں کہ عمرو عاص (وزیرِ معاویہ) بساطِ جنگ پر ایک سیاسی چال چل گیا جس سے ہاری بازی سدھر گئی۔ یعنی الحرب خدعتہ (جنگ کا دوسرا نام پالیسی ہے) کے مطابق اُس نے مشورہ دیا "کہ فوراً نوکِ نیزہ پر قرآن نصب کر دو اور اعلان کر دو ندعُوکُمْ اِلیٰ کِتَابِ اللّٰہِ وھٰذٰا حَکَمٌ بَیْنَنَا وَ بَیْنَکُمْ (اے مسلمانو! ہم تم کو کتابِ خدا کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور یہی ہمارے تمہارے درمیان تصفیہ کرا دے گی) اگر یہ دعوت علیِ مرتضیٰ نے رد کر دی تو اُن کے ساتھیوں میں اختلاف پیدا ہو جائے گا" اور ہمارے طرفداروں میں ثباتِ عزم۔ لہٰذا قرآن بلند کر دیے گئے، بعض تابعین علی نے لبیک کا نعرہ لگا دیا۔ علی بن ابی طالبؑ نے جب دیکھا کہ بنا بنایا کھیل بگڑا جاتا ہے۔ اپنے لشکر سے پکار کے کہا: انا اعرف بھم منکم معاویہ عمرو عاص اور ابنِ ابی سرح کو میں تم لوگوں سے زیادہ سمجھتا ہوں وَیْلَکُمْ! مَا رَفَعُوْھَا

اِلَّا مَکِیْدَۃً (ارے تمھارا بُرا ہو! اُنھوں نے بڑا چھل فریب کیا ہے) لوگ چیخنے لگے۔ یَا عَلِیُّ اَجِبْ اِلٰی کِتَابِ اللّٰہِ اِذَا دُعِیْتَ (یا علی جب کتابِ خدا کو درمیان میں رکھا جارہا ہے تو آپ کو ماننا چاہیے۔) آنجناب نے مجبور ہو کے اپنے لشکر کو التوائے جنگ کا حکم دیدیا۔ حالانکہ مالکِ اشتر نے جن کی طرف آثارِ فتح نمایاں ہو چلے تھے امتثالِ امر میں درنگ کی۔ لیکن کیا کرتے حکمِ حاکم۔ اُنھوں نے بھی تلوار روک لی۔

اُس وقت اشعث بن قیس خدمتِ علی مرتضیٰؑ میں آیا۔ اور عرض کی، اگر آپ حکم دیں تو میں امیر معاویہ کے پاس جاکے معاملات طے کراؤں۔ آپ نے اجازت دیدی۔ وہ گیا۔ امیر معاویہ نے اپنی جانب سے عمرو عاص کو حکم (پنچ) تجویز کیا، اور تابعینِ علی مرتضیٰؑ نے ابوموسیٰ اشعری کو۔ حالانکہ علی بن ابی طالبؑ نے بار بار فرمایا: "اِنَّہٗ یَضْعَفُ مِنْ عَمْرٍو (سیاسی معاملے میں ابوموسیٰ عمرو عاص سے ہیٹا پڑے گا) ابن عباس یا مالک اشتر کو اپنی طرف سے حکم بناؤ۔ لیکن اشعث اور اُس کے ساتھیوں نے نہ مانا

مجبوراً آنجناب نے بھی ارشاد فرما دیا: "اِصْنَعُوْا مَا اَرَدْتُّمْ" جو جی چاہے کرو۔ لہٰذا طرفین کی فوج واپس ہو گئی۔

کچھ روز بعد دَوْمَةُ الْجَنْدَل پہ مسلمانوں کا اجتماع ہوا۔ اور طرفین کے دونوں حکموں کی موجودگی میں گفتگو شروع ہوئی۔ عمرو عاص نے معاملے میں کچھ ایسی پیچیدگی پیدا کر دی کہ ابو موسیٰ کو یہی کہتے بنا اِنِّی قَدْ خَلَعْتُ عَلِیًّا وَّمُعَاوِیَۃَ (میں علی مرتضیٰؑ اور معاویہ دونوں کو ترک کرتا ہوں) جھگڑا تو چکے۔ مسلمانو! ان دونوں کے علاوہ جس کسی کو تم اہل سمجھو اپنا امیر و خلیفہ تجویز کرلو۔ یہ کہہ کے ابو موسیٰ ایک طرف ہو گئے۔ عمرو عاص کو یہی کہنا تھا کیونکہ آپس میں طے ہو چکا تھا۔ لیکن تقریر جو شروع کی تو کہا: "اَیُّھَا النَّاس! اَبُوْمُوْسیٰ قَدْ خَلَعَ صَاحِبَہٗ وَاَنَا اَیْضًا قَدْ خَلَعْتُ صَاحِبَہٗ وَاَبْقَیْتُ صَاحِبِیْ مُعَاوِیَۃَ عَلَی الْخِلَافَۃِ" (بھائیو! ابو موسیٰ اپنے خلیفہ سے دست بردار ہو گئے۔ اور میں بھی اُن کے خلیفہ (علیؑ) سے دست بردار ہو گیا۔ اور اپنے امیر معاویۃ

کو عہدۂ خلافت پر باقی رکھا۔" (نور الابصار)

وہی ہوا جو علیؑ مرتضیٰؑ نے پہلے فرما دیا تھا۔ابوموسیٰ چوٹ کھا گئے۔ دونوں میں تو تو میں میں شروع ہوگئی بلکہ دونوں جماعتوں کے افراد میں مکّے بازی، عصا و دُرّہ بازی کی نوبت پہنچ گئی۔ اُس طوفانِ بدتمیزی میں لوگ ابوموسیٰ کو تلاش کرنے لگے۔ اب اُن کا پتہ کہاں۔ صرف اتنا معلوم ہوسکا کہ بیچارے اونٹ پر سوار ہو کے سیدھے مکّے شریف کی پگ ڈنڈی پر ہولیے اور نکیل ہاتھ سے چھوڑ دی۔ اہلِ نہروان جو درپردہ مخالفِ علیؑ مرتضیٰؑ تھے اُن کی اُمید بر آئی۔ عمروعاص وغیرہ نے شام میں پہنچ کے خلافتِ معاویہ کا اعلان کردیا۔ ادھر ابنِ عباسؓ نے آکے علیؑ مرتضیٰؑ سے کیفیت بیان کی۔ آپ نے اہلِ کوفہ کے سامنے ایک مطمئن تقریر کے دوران میں فرمایا: "اِنَّ الْمَعْصِيَةَ تُورِثُ الْحَسْرَةَ وَ تُعْقِبُ النَّدَامَةَ (نافرمانی سے حسرت پیدا ہوتی ہے اور ندامت باقی رہ جاتی ہے) میں نے نہیں کہا تھا کہ یہ دونوں حکم تسفیہ حق نہ کرسکیں گے؟ تم لوگوں نے نہ مانا اور اس شعر ھوازن کے مصداق ہوئے۔

أَمَرْتُهُمْ أَمْرِي بِمُنْعَرَجِ اللِّوَى فَلَمْ يَسْتَبِينُوا النُّصْحَ اِلَّا ضُحَى غَدٍ

(پہاڑی کے موڑ پر) موقعہ پر سمجھا دیا تھا کہ دیکھو یہ ہونے والا ہے۔ مگر پھر بھی نہ مانے۔

طرفدارانِ امیر معاویہ اپنے خلیفہ کی موافقت میں پروپیگنڈا کرنے لگے۔ اور علی مرتضیٰؑ کے تابعین اُن کے استقرار حق کے لیے تقریریں کرنے لگے۔ چنانچہ ابن عباسؓ وغیرہم کی طرح عبد اللہ بن جعفرؓ نے بھی تقریر کی تھی جو خطبۂ تحکمین کے نام سے موسوم ہے۔ جس کا لُبِّ لباب یہ ہے:

وَاِنَّا الْيَوْمَ لِعَلِيٍّ كَمَا كُنَّا عَلَيْهِ اَمْسِ (ہم آج بھی علی مرتضیٰ کے ایسے ہی موافق ہیں جیسے کل تھے)

علاوہ قابلیتِ علمی کے تیسرا شرف جناب عبد اللہ کا یہ تھا کہ حسب و نسب میں چوکھے تھے۔ خود امیر المومنینؑ کے بھتیجے اور رسولؐ کے ذوی القربیٰ میں شامل تھے۔ چوتھے مال و ثروت۔ جود و کرم میں یکتا ہی عصر چنانچہ کثرتِ عطا کے سبب سے لوگ اُنھیں بحر الجود کہتے تھے۔ حتیٰ کہ نصیب ایک شاعر عرب نے آپ کے سخا و کرم پر نظر کرتے ہوئے یوں مدح کی ہے:

مفہومِ کرم کا دلچسپ تقابل

عَرَفْتَ مِنَ الْاَشْیَاءِ سِوٰی نَعَم اَلِفْتَ نَعَمْ حَتّٰی کَاَنَّکَ لَمْ تَکُنْ
ہاں سے تو آپکو اتنی اُلفت ہو گئی ہے گویا کہ دُنیا بھر میں آپ سوائے (ہاں) کے کچھ جانتے ہی نہیں۔

سَمِعْتَ بِلَا فِیْ سَالِفِ الدَّہْرِ وَالْاُمَم وَعَادَیْتَ لَا حَتّٰی کَاَنَّکَ لَمْ تَکُنْ
نہیں سے آپکو اتنی نفرت ہے جیسے کبھی آپ نے کانوں سے سُنی ہی نہیں۔

ہائے! اس وقت مجھے فرزدق کے قصیدے کا وہ شعر یاد آگیا جو اُس نے امام زین العابدینؑ کی مدح میں حج کے موقع پر ہشام بن عبدالملک کے سامنے برجستہ کہا تھا:

مَا قَالَ لَا قَطُّ اِلَّا فِیْ تَشَہُّدِہٖ لَوْلَا التَّشَہُّدُ کَانَتْ لَاؤہٗ نَعَم
اس عابدِ کرم غنیمت نے سوائے تشہد کے (لا) کبھی زبان سے کہا ہی نہیں۔ اگر تشہد نہ ہوتا تو وہ لا کی جگہ (نعم) ہی کہا کرتا۔ نصیب نے تو (نعم) سے ممدوح کی صرف الفت ہی بیان کر کے ثابت کی ہے کہ وہ تمام موجودات عالم میں (نعم) کے سوا کسی شئے کو جانتا پہچانتا ہی نہیں۔ اور (لا) کا تو ایسا دشمن ہے کہ کبھی سُنا ہی نہیں۔ تو گیا اُس کا ممدوح معاذ اللہ

تشہد میں بھی (لا) نہیں کہا کرتا تھا۔
شاعر اپنے مقصد کے ادا کرنے کے لیے ایک مقام پر آ کے رُک گیا۔ اور مضمونِ مدح کی وسعت پر نظر نہیں ڈالی۔ اور (گویا جانتا ہی نہیں) کہہ کے تو اور بھی مقصد کو کمزور کر دیا گیا ہے، جس سے سُننے والے کے یقین میں شبہ پیدا ہو گیا۔ دوسرے عدادت اُسی چیز سے ہوتی ہے جس کا انسان کو پہلے سے علم ہو۔
برخلاف فرزدق کے جو کہتا ہے میرے ممدوح نے تو (لا) کبھی کہا ہی نہیں۔ ہاں تشہد میں ضرور کہا (کیونکہ ایک زبردست عالمِ توحید ہے) فرض کیا کہ تشہد نہ ہوتا تو وہ ہمیشہ نعم ہی نعم کہا کرتا۔ اُس کو (لا) کا علم ہی نہ ہوتا کہ نعم کے سامنے اس کا وجود داخلِ اشیا ہے یا نہیں۔
عرفی شیرازی نے اس عربی تخیل کو عجمی رنگ دے کے کہا ہے اور معیارِ کرم کو اپنی فکرِ فلک پیما سے اتنا بلند کر دکھایا ہے کہ اُس کے آگے خاتمہ نظر آتا ہے۔ کہتا ہے:
اقبالِ کرم می گزد اربابِ ہمم را ہمت نخورد نیشترِ لا و نعم را
یعنی جو افراد حقیقتاً اہلِ کرم ہیں اُن کی عالی ہمتی یہ بھی گوارا

نہیں کرتی کہ اُنھیں کوئی صاحبِ کرم کہے۔ لہذا وہ (لا و نعم)
کے سوال ہی کو پیدا نہیں ہونے دیتے۔ یعنی سائل کو بغیر مانگے
نعمت بخش دیتے ہیں۔
لا تو لا ہی ہے جو تشبیہاً اور استعارتاً دونوں صورتوں میں
ایک کریم کے لیے جگر خراش نشتر ہے۔ اُن کے نزدیک لفظِ
(نعم) کہنا بھی جس سے شانِ سخاوت ظاہر ہوتی ہے
اور جس کو وہ پسند نہیں کرتے) انکارِ کرم کا مترادف ہے۔
قابلِ لحاظ یہ امر ہے کہ شاعر کلا و نعم دونوں کو جن میں
بُعد مشرقین ہے ایک ہی مرکز پہ زبردستی کھینچ لایا ہے۔

بنی ہاشم کا افتخارِ کرم

عبداللہ ابنِ جعفر کے جود و کرم کے متعلق تو آپ اوپر
پڑھ چکے۔ اب اُن کے پوتے عبداللہ بن معاویہ، بن
عبداللہ ابنِ جعفر کے تفاخرِ کرم پر نظر کیجیے۔ یہ بزرگ
اپنے وقت کے زبردست ادیب شاعر تھے۔ ذرا سخت
دل اور ضعیف الاعتقاد مشہور تھے۔ جاہ طلبی میں زندگی ختم
ہوئی۔ تابعین کا اچھا خاصا گروہ ہو گیا تھا، جس کی مدد سے
اصفہان میں آ کے صاحبِ حکومت ہو گئے تھے، اور کرمان

شیراز اور قم وغیرہ زیرِ نگین تھے۔ اس وقت بنی ہاشم کو بڑی بڑی جاگیریں اور عہدے ملے۔ آخرِ کار ابو سلمہ نے قتل کر دیا۔ یہ اشعار انھیں کے ہیں۔

اَرَیٰ نَفْسِی تَتُوقُ اِلیٰ اُمُوْرٍ ۔۔۔ وَیَقْصُرُ دُوْنَ مَبْلَغِهِنَّ مَالِی

میرا جی تو یہ چاہتا ہے کہ بڑے بڑے کاموں میں ہاتھ ڈال دوں۔ لیکن جب اُن کی تکمیل کے لیے اپنی تھیلی ٹٹولتا ہوں تو مبلغ علیہ السلام ندارد۔ لہٰذا میرے سب ارادے خاک میں مل جاتے ہیں۔ (حماسہ باب الادب)

فَنَفْسِی لَا تُطَاوِعُنِی بِبُخْلٍ ۔۔۔ وَمَالِی لَا یُبَلِّغُنِی فَعَالِی

میرے نفسِ کریم سے یہ بھی برداشت نہیں ہوتا کہ ہاتھ روک کے خرچ کروں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ میری تمام دولت میرے کردارِ بلند کے مقابلے میں بالکل ناکافی ہے۔

کون ہے جو اس جوانِ بنی ہاشم کی کھری خودستائی کے سامنے سرِ تسلیم خم نہ کر دے، جس کے جدِ محترم کے نام پر جود و سخا کی مُہر لگی ہوئی ہے۔

کرمِ ہاشمی

صاحبِ قاموس جنابِ ہاشم کے متعلق لکھتے ہیں کہ اُن کا

اصلی نام تو عمرو تھا، لیکن ایک مرتبہ مکے میں شدید قحط پڑا۔ اُس سخی نے اپنے تمام بیش قیمت سُرخ بالوں والے اونٹ فروخت کر ڈالے، اور بھوکوں کو روٹی کے پارچے اور سالن تقسیم کرنا شروع کر دیا۔ تمام عرب میں اس جود و کرم کی شہرت ہو گئی۔ چنانچہ ایک شاعر نے یوں مدح کی:

عَمرو العُلیٰ ھَشَمَ الثرِیدَ لِقَومِہٖ ورِجالُ مَکّۃَ مُسنِتُونَ عِجَافُ

(جس وقت مکے کے لوگ فاقوں کے مارے سُوکھ کے کانٹا ہو گئے تھے، اُس وقت بزرگ منش عمرو (ہاشم) نے اُنھیں سالن روٹی تقسیم کیا)۔

اُس وقت سے ہاشم لقب ہو کے اسم معرفہ ہو گیا۔ جس کے معنے (روٹی کے پارچے اور سالن تقسیم کرنے والا) ہیں۔ حضرت مردوں کا تو ذکر ہی کیا، بقولِ مشہور ع این خانہ تمام آفتاب است۔ اس گھر کی خواتین کا بھی یہی عالم ہے کہ اپنے خاندانی فضل و شرف کے گیت گا گا کے مگن رہتی ہیں۔ دیکھیے حضرت عبد المطلب کی صاحبزادی صفیہ فرماتی ہیں:

اَلَا مَنْ مُبْلِغٌ عَنَّا قُرَیشًا فَفِیمَ الْاَمْرُ فِینَا وَالْاِمَارُ

(ترجمہ شعر صفحہ ۷۷) ہماری طرف سے قریشِ مکہ سے کوئی یہ تو جا کے کہدے کہ بنی ہاشم کے فضل و شرف کے ماننے میں تمھیں کیا کلام ہے۔
(حماسہ)
(باب الاضیاف والمدائح)

اِذَ السَّلَفَ الْمُقَدَّمِ قَدْ عَلِمْتُمْ وَلَمْ یُوْقَدْ لَنَا بِالْغَدْرِ نَارٌ
(ہمارے اسلاف (عبد المطلب، ہاشم، عبد مناف) کو تو تم جانتے ہی ہو کہ اُنھوں نے کبھی کسی سے غدّاری نہیں کی کہ مطعون ہوے ہوں)
وَکُلُّ مَنَاقِبِ الْخَیْرَاتِ فِینَا وَبَعْضُ الْاَمْرِ مَنْقَصَۃٌ وَعَارٌ
(کُل اچھے اوصاف جو انسان میں ہونے چاہییں وہ ہم میں موجود ہیں۔ اور وہ افعال جو انسانیت کے لیے ننگ وعار ہیں وہ بھلا ہم میں کہاں؟ تمھیں میں ہونگے)

بہرحال عبد اللہ بن جعفر کی سخاوت اظہر من الشمس ہے۔ بقولِ صاحبِ "غرر الخصائص" اُس خوش نصیب شاعر کو جس کے یہ مدحیہ اشعار اوپر نقل کیے گئے ہیں۔ ممدوح نے دس ہزار درہم مع شترانِ گراں بار بطورِ صلہ عنایت کر دیے۔
کہتے ہیں کہ نصیب سیاہ فام تھا، اور ابتدا ئً شاید کسی امیر کا

زر خرید غلام بھی۔ لوگوں نے جناب عبداللہ سے کہا: "آپ نے اتنی دولت و حشمت ایک حبشی نژاد کو بخش دی۔" فرمایا: "اگرچہ وہ سیاہ فام ہے، مگر اس کے اشعار نورانی ہیں، گو وہ مملوک ہے، مگر اس نے ایک مردِ آزاد کی مدح کی ہے۔ مانا کہ چند روز میں وہ زیرِ خاک نہاں ہو جائے گا۔ لیکن اس کے اشعار زمانے میں روزِ روشن کی طرح چمکیں گے۔"

جس نوجوان بنی ہاشم نے جناب زینبؑ کے لیے خواستگاری کی تھی وہ ان اوصافِ حمیدہ کا حامل اور فضل و شرف میں کامل تھا۔

ایک نااہل کی تزویج جناب زینب کیلیے درخواست

اور سنیے، شرح نہج البلاغۃ میں ابن ابی الحدید نے لکھا ہے کہ اشعث بن قیس نے جو قبیلۂ کندہ کے رؤسا میں سے تھا (غالباً وہی اشعث بن قیس جو جنگ صفین میں علی مرتضیٰؑ کا طرفدار تھا جس کا اوپر ذکر ہو چکا ہے) علی مرتضیٰؑ کی خدمت میں درخواست کی کہ اپنی دختر فرخندہ اختر جناب زینبؑ کو میرے عقد میں دیدیجیے۔ اس کندۂ ناتراش کا یہ کلام سن کے آنجناب کا چہرہ غصے سے متغیر ہو گیا۔ فرمایا: "اے اشعث اپنی صورت تو ذرا آئینے میں

دیکھ! تو اور شبیہِ خدیجہؑ۔ دخترِ زہراؑ۔ زینبؑ سے خواہشِ عقد خبردار! اگر تو نے دوبارہ ان الفاظ کا اعادہ کیا تو یاد رکھ علی کی ذوالفقار ہوگی اور تیری گردن۔ تیری کیا ہستی کہ یادگارِ زہراؑ سے ہمکلام ہو! اسد اللہ کے تیور دیکھ کے بنِ قیس کیا دیوانہ تھا جو اور کچھ کہتا۔ سہم ہی کے تو رہ گیا۔

حاصلِ کلام یہ کہ علی بن ابی طالبؑ نے درخواستِ جنابِ عبداللہ منظور کر لی اور نیک دن اور تاریخ مقرر کر کے جنابِ زینبؑ کے دو بول کر دیئے۔ اور شوہر کے ساتھ سُسرال رُخصت کر دیا اُس وقت جنابِ زینبؑ کی عمر غالباً گیارہ سال کی ہوگی۔

دولھا نے ایک شاندار دعوتِ ولیمہ دی۔ دُلھن پر بڑے بڑے صدقے نچھاور ہوئے۔ فقرا و مساکین کی حاجتیں بر آئیں۔ حقیقت یہ ہے کہ بڑا مبارک رشتہ ہوا۔ بمقتضائے محبتِ دُختر، علی مرتضیٰؑ روزانہ خانۂ عبداللہ میں تشریف لاتے تھے اور بیٹی داماد کو دیکھ کے مسرور ہوتے تھے۔ اور یہ معمول کر لیا تھا کہ ہر ہفتے ایک شب امام حسنؑ کے یہاں، دوسری شب امام حسینؑ کے گھر پر۔ تیسری شب جنابِ زینبؑ کے مکان پر آرام فرماتے تھے۔ حتیٰ کہ جب آنجناب نے کوفہ کو دارالخلافہ بنایا

توجنابِ عبداللہ کو بھی مع اہل وعیال کے ساتھ لے گئے جہاں
خلافتکدے میں جنابِ اُمامہ سوتیلی ماں بھی موجود تھیں۔
لیکن ذمہ دارانہ حیثیت جنابِ زینب ہی کو حاصل تھی۔
کوفے اور عراق کی خواتینِ محترمہ شوقِ ملاقاتِ زینب کیلیے
حاضر ہوتی تھیں اور فاطمہ زہراؑ کی طرح اُن کا ادب کرتی
تھیں۔ رہے جنابِ عبداللہؓ تو وہ ایسے رفیق دمتین
علی بن ابی طالب رہے کہ کوئی جنگ اور کوئی اہم سیاسی مجلس
ایسی نہ تھی جس میں اُنھوں نے نمایاں حصہ نہ لیا ہو۔

حسرت آیات وفاتِ عبداللہؓ

صاحبِ درر الخصائص بھیر لکھتے ہیں کہ جنابِ عبداللہؓ بھی
اُن کریمانِ جہاں میں سے ہیں، جنھوں نے مخلوقِ خدا پر
سخاوکرم کی بوچھار کردی تھی۔ لیکن آخر وقت مفلوک الحال ہو کے
سفرِ آخرت کیا۔ بقول ابوالفرج عبدالملک بن مروان کا زمانہ
تھا، اُس نے سخت گیری کی اور تمام جائدادِ جنابِ عبداللہؓ
ضبط کرلی۔ آنجناب نے ایک جمعہ کو مسجدِ نبوی میں با دلِ
دردمند فریضہ ادا کیا، اور درگاہِ باری میں بخضوع وخشوع دل
دستِ دعا بلند کردیے:

"بارِ الہا! میری وضعِ کرم کو قائم رکھ ورنہ دُنیا سے اُٹھا لے"۔ مقبول الدعوات تھے، دوسرے جمعہ کو اسی مسجد میں نمازِ جنازہ ادا ہوئی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ۝

اولادِ جنابِ زینبؑ

جنابِ عبداللہؓ کی تعدادِ اولاد جو بطنِ جنابِ زینبؑ سے ہوئی، اُس میں مورخین کو اختلاف ہے۔ لیکن اکثریت اُسی کی تائید کرتی ہے، جو ابنِ جوزی نے مقرر کی ہے۔ یعنی چار فرزند علی، عونِ الاکبر، محمد، عباس۔ اور ایک دختر اُمِ کلثوم عونؑ، و محمد نصرتِ حسین میں شہیدانِ کربلا میں شامل ہیں، جن کا ذکر آگے آئے گا۔

امیرِ معاویہ و جنابِ عبداللہ

اوپر کے صفحات میں آپ کی نظر سے گزر چکا ہے کہ امیر معاویہ عبداللہ بن جعفر کو ایک رقمِ کثیر بطورِ صلۂ رحم سالانہ دیا کرتے تھے۔ اور یہ بھی آپ کو معلوم ہے کہ سیاساتِ عرب میں اُس وقت خلیفہ دوم عمر بن الخطاب کے بعد اُنہیں کا اول نمبر تھا۔ عہد کے خلاف امام حسنؑ کے بعد یزید اپنے پسرِ ناخلف کو ولیعہدِ سلطنت مقرر کر چکے تھے۔ غرضیکہ یہ تھا۔

کہ میرے بعد بنی ہاشم یزید کے خلاف علمِ مخالفت نہ بلند کر دیں، اور امام حسینؑ ایسے مقتدر اور باعزت ہستی کی پیروی کرنے لگیں۔ لہٰذا دو ہی صورتیں حصولِ مقصد یعنی استحکامِ خلافتِ یزید میں کامیاب ہو سکتی تھیں۔ اوّل حریصانِ عرب پر دولت کی بارش۔ دوسرے بنی ہاشم سے رابطۂ اُلفت و اتحاد۔ چنانچہ عطائے زر و مال تو ایک حد تک ختم ہو چکا تھا۔ لیکن بنی ہاشم سے رشتۂ اتحاد محکم کرنے کا کوئی ذریعہ نہیں معلوم ہوتا تھا۔ لہٰذا اولادِ عبداللہؓ کی طرف امیرِ معاویہ کی نظر پہنچی۔ اور بمشورۂ امرائے شام اُن کی دختر اُمِ کلثوم سے جو شادی کے قابل ہو چکی تھیں اور ساتھ ہی جمیلہ و عقیلہ بھی تھیں، یزید کا عقد کرنا چاہا۔

چنانچہ اس مقصد کے ماتحت امیرِ معاویہ نے مروان بن حکم (حاکمِ حجاز) کے پاس مدینے ایک خط بھیجا کہ میری طرف سے عبداللہ بن جعفر کے پاس جاؤ، اور اُمِ کلثوم اُن کی دختر کے ساتھ یزید کے عقد کا پیغام دو۔ لہٰذا مروان نے آ کر انکشافِ معاملہ کیا۔ جناب عبداللہ نے جواباً کہا: "اگرچہ اُمِ کلثوم میری دختر ہے لیکن اُس کا اختیار سید و سردار

بنی ہاشم امام حسینؑ کے ہاتھ میں ہے (اگلے وقتوں میں خاندان کے بڑے بوڑھے اس معاملے میں مختار ہوا کرتے تھے) چنانچہ وہ امام حسینؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور صورتِ مدعا پیش کی۔ آنجناب نے فرمایا: "کہ اس معاملے میں خداوندِ عالم سے استخارہ کروں گا" اس کے بعد جواب دیا جائیگا۔

دو ایک روز بعد جب امام حسینؑ مسجد میں تشریف لائے تو مروان بھی مع چند عمر رسیدگان بنی ہاشم و بنی اُمیہ کے داخلِ مسجد ہوا۔ اور بتدریج کہنا شروع کیا کہ امیر معاویہ نے مجھے اس امر کے لیے متعین کیا ہے کہ یہ رشتہ طے کر لوں۔ عبداللہ جو مہر تم معین کریں منظور کر لوں۔ نیز اُن کو تمام بارِ قرض سے سبکدوش کر دینے کا بھی ضامن ہو جاؤں۔ اور رابطۂ صلح و اتحاد درمیانِ بنی ہاشم و بنی اُمیہ مستحکم کر دوں۔ اگر یہ رشتہ ہو گیا تو بنی ہاشم پر زمانے کی نظرِ امتیاز پڑنے لگے گی بلکہ یزید سے بھی زیادہ۔ اُس کے بعد یزید کی جلالت و سخاوت کا ذکر کرتے ہوئے کہا: اَلسَّحَابُ یَسْتَسْقِیْ بِلِقَائِہٖ۔ اُسکے دیدار سے ابر سیراب ہونے کی تمنا کرتا ہے۔ اتنا کہہ کے مروان نے سکوت اختیار کیا۔

اب افصح العرب امام حسینؑ کی باری آئی، آپ نے حمد و صلوٰۃ کے بعد جواباً فرمایا: "مہر کے متعلق تو یہ کہ اس کو شرع شریف کے مطابق ہونا چاہیے جو خود اپنے اور خاندان کے نکاحوں کے وقت میرے جدِ بزرگوار کا معمول رہا ہے۔ میں بھی اُسی حکم کا پابند ہوں۔

بھائی عبداللہ کے قرض کے متعلق یہ کہ ہمارے خاندان میں کوئی ایسی مثال نہیں ملے گی، کہ باپ کا قرض بیٹی کے ذریعے سے ادا ہوا ہو۔ رہا بنی ہاشم اور بنی اُمیہ کے درمیان مصالحت کا سوال۔ تو وہ حق کیا جسے باطل سے مغائرت نہ ہو، دُنیا کے لیے ہم صلح نہیں چاہتے۔ اور تم نے یہ جو کہا کہ یزید سے زیادہ لوگ ہم سے غبطہ کریں گے تو ذرا غور کرنے کی بات ہے۔ جو لوگ خاندانِ رسول کی عظمت و شرف پہ غبطہ کرتے ہیں وہ جاہل ہیں اور جو عزتِ دُنیا کے اعتبار سے یزید پر غبطہ کرتے ہیں وہ بڑے عقلمند ہیں۔ دُنیا اسی کا نام ہے۔ آخر میں جو تم نے سخاوتِ یزید کے متعلق کہا کہ اُس کے دیدار سے ابر سیرابی چاہتا ہے۔ تو یہ مثل حقیقی طور سے سوائے رسولِ کریمؐ کے دُنیا میں کسی کے جود و کرم پر صادق نہیں آتی۔ اس رفادے

امام حسینؑ نے حضرت ابو طالب کے اُس شعر کی طرف اشارہ کیا ہے جو اُنھوں نے مدح رسول اللہ میں کہا تھا:

ابیض یستسقی الغمام بوجہہٖ　　ثمال الیتامی عصمۃ للاراملِ

(طراز المذہب)

اُس (سیف اللہِ مسلول) کا کرم باش تُوانی دیکھ کے خود تقاضائے ابر پانی مانگتا ہے۔ اُس کی دوسری صفت یہ ہے کہ یتیموں کا پناہ گاہ اور رانڈوں کا محافظ ہے (رزم و بزم دونوں میں جوہرِ فرد ہے) کریم السجایا جمیل الشیم۔

ہاشمیہ کا ہاشمی سے پیوند

اُس کے بعد امام حسینؑ نے مجمع کی طرف مخاطب ہو کے فرمایا: "آپ حضرات گواہ رہیں کہ میں ام کلثوم دختر عبد اللہ بن جعفر کو اُس کے چچا زاد بھائی قاسم بن محمد بن جعفر کے عقد میں دیتا ہوں، اور اُس کا مہرِ شرعی مقرر کرتا ہوں۔ علاوہ اس کے میں اپنی ذاتی ملکیت سے ایک قطعۂ زمین جس کی آمدنی آٹھ ہزار دینار سالانہ ہے، دولھا دُلھن کی فلاحِ معیشت کیلیے بخشتا ہوں۔

مروان بن حکم نے اس معاملے میں ایسی مونھ کی کھائی کہ

اور کچھ تو بنا نہیں کہنے لگا: "میں دیکھتا ہوں کہ آلِ ہاشم ہمیشہ بنی امیہ سے برسرِ عناد ہی رہنا چاہتے ہیں۔" امام حسینؑ نے فرمایا: "تمھیں یاد ہوگا جب میں نے عائشہ دخترِ عثمان سے خواہشِ عقد کی تھی تو تم نے جھٹ سے عبداللہ بن زبیر سے اس کا عقد کر دیا تھا۔ اب شکایت کیسی کما تدین تدان۔"

شرفِ اولادِ فاطمہؑ

ینابیع المودۃ میں حضرت عمرؓ بن الخطاب سے یہ قولِ رسول منقول ہے "کُلُّ سَبَبٍ وَنَسَبٍ یَنْقَطِعُ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ اِلَّا سَبَبِیْ وَنَسَبِیْ" (روزِ قیامت ہر سبب و نسب منقطع ہو جائیگا سوائے میرے نسب کے۔ دُنیا میں ہر ماں سے پیدا ہونیوالا بچہ اپنے باپ کے سلسلے سے منسوب ہوتا ہے سوائے اولادِ فاطمہؑ کے کہ میں اُن کا پدر اور خاندان ہوں) اسی مقصد کی اور دوسری احادیث بھی ہیں جو جنابِ فاطمہ زہراؑ اور رسولؐ کے معتقد صحابی جابر بن عبداللہ انصاریؓ سے منقول ہیں۔ جنابِ جابرؓ کہتے ہیں کہ ایک روز میں اور عباس بن عبدالمطلب خدمتِ نبویؐ میں حاضر تھے کہ علی بن ابی طالبؑ آئے اور سلام کیا۔ رسول اللہؐ نے جوابِ سلام دیا۔ کھڑے ہو گئے۔ معانقہ کیا۔ پیشانی پر

بوسہ دیا۔ اور اپنے جانبِ راست بٹھا لیا۔ حضرت عباسؓ نے عرض کی۔ "یا رسول اللہؐ کیا آپ کو علیؑ سے محبت ہے"۔ فرمایا: "واللہ بے انتہا محبت ہے اِنَّ اللّٰہَ جَعَلَ ذُرِّیَّتَہٗ کُلِّ نَبِیٍّ فِیْ صُلْبِہٖ وَجَعَلَ ذُرِّیَّتِیْ فِیْ صُلْبِ ھٰذَا (خداوندِ عالم نے ہر نبی کی اولاد اُس کے صلب میں رکھی ہے' اور میری ذریت علیؑ کے صلب میں)

واقعہ

امام موسیٰ بن جعفرؑ فرماتے ہیں: "ایک روز مجھ سے خلیفۂ عرب ہارون رشید عباسی نے کہا کہ آپ حضرات نے خواص و عوام کے لیے یہ امر کس طور سے جائز رکھا ہے کہ وہ آپ کو رسول اللہؐ سے منسوب کرتے ہیں' اور یا ابن رسول اللہؐ کہہ کے پکارتے ہیں۔ حالانکہ آپ اولادِ علیؑ سے ہیں۔ اور ہر فرزند اپنے پدر ہی سے منسوب ہوتا ہے رہیں جنابِ فاطمہؑ تو اُن کی طرف سے بیشک رسول اللہؐ آپ کے نانا ہوتے ہیں"۔

میں نے (موسیٰ بن جعفرؑ) جواب دیا: "فرض کر لیجیے کہ اس وقت رسول اللہؐ دُنیا میں پھر تشریف لے آئیں اور آپکی

صاحبزادی اپنے نکاح کے لیے طلب کریں تو کیا آپ اُن کو صاف جواب دیدیں گے ؟"

ہارون رشید : "جواب کیوں دینے لگا۔ بلکہ میں تو اس رشتے سے اقوامِ عرب و عجم و قریش پر فخر کروں گا۔"

امام : "لیکن رسول ہماری لڑکی نکاح کے لیے نہیں طلب کر سکتے نہ ہم ہی اُس کا نکاح آنحضرتؐ سے کر سکتے ہیں ۔"

ہارون رشید : "یہ کیسے ؟"

امام : "یہ اس وجہ سے کہ ہم اُن کی اولاد سے ہیں، اور آپ نہیں ہیں ۔"

ہارون رشید : "موسیٰ بن جعفرؑ آپ نے کیا خوب بات کہی۔ لیکن یہ تو بتلیئے کہ آپ لوگ اپنے کو ذریتِ نبیؐ کیسے کہتے ہیں، حالانکہ نبیؐ نے کوئی فرزند نرینہ نہیں چھوڑا جس سے سلسلہ چلتا۔ لڑکی سے تو کسی کا نسب نہیں چلا کرتا۔ آپ تو اولادِ دختر ہیں، جس کو نسب سے کوئی علاقہ نہیں ۔"

امام : "بحق قرابت رسولؐ و بہ طفیل روضۂ رسولؐ آپ مجھے اس مسئلے پر مزید گفتگو سے معاف رکھیے ۔"

ہارون رشید:۔ "یہ تو نہ ہوگا۔ جب تک آپ میری بات کا جوابِ دلیلِ قرآنی کے ساتھ نہ دیدیں۔ آپ اولادِ علیؑ اور حاوی القرآن کیسے کہے جاتے ہیں، اُس کے ہر جزو کی تاویل آپ کے علم میں ہے، اور پھر اس آیتِ قرآنی سے احتجاج کیا کرتے ہیں وَمَا فَرَّطْنَا فِی الْکِتٰبِ مِنْ شَیْءٍ (ہم نے قرآن میں کچھ نہیں چھوڑا۔ اُس میں سب کچھ ہے) نیز رای علماء، اور فضلا سے آپ مستغنی ہیں۔"

امام: "اچھا تو پھر جواب دوں؟"

ہارون رشید: "ہاں ضرور۔"

امام نے یہ آیۂ مبارکہ تلاوت فرمائی جس میں ذُریتِ آدمؑ کا ذکر ہے: "وَمِنْ ذُرِّیَّتِہٖ دَاوٗدَ وَسُلَیْمٰنَ وَاَیُّوْبَ وَیُوْسُفَ وَمُوْسٰی وَھٰرُوْنَ ؕ کَذٰلِکَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۙ وَزَکَرِیَّا وَیَحْیٰی وَعِیْسٰی الخ (ہارون سے مخاطب ہو کے) اے امیر المومنین حضرتِ عیسیٰ کے پدر کون تھے؟

ہارون: "حضرتِ عیسیٰ تو بغیر باپ کے تھے۔"

امام: "بس سمجھ لیجیے جس طرح جنابِ مریم کے توسط سے جنابِ عیسیٰ ذُریتِ انبیاؑ میں داخل ہو گئے۔ اسی طرح ہم

اپنی مادرِ محترمہ جنابِ فاطمہؑ کے سبب سے نسبِ رسول میں داخل ہیں۔ غالباً اتنا کافی ہے۔ کہیے تو کچھ اور عرض کروں۔"
ہارون: "ہاں ہاں، فرمائیے!"
امامؑ نے آیۂ مباہلہ فرمائی جس میں حسنینؑ کو رب العزت کی طرف سے فرزندیٔ رسولؐ کی سند ملی ہے۔ ہارون رشید نے اس استدلال کے آگے سر تسلیم خم کر دیا۔
تیسری سند شرف اولادِ فاطمہؑ کے لیے حدیثِ کساء ہے جس وقت رسولؐ نے علیؑ و فاطمہؑ حسنؑ و حسینؑ کو اپنی چادر میں لیکے دربارِ رب العزت میں دعائے خیر فرمائی تھی۔
اس مختصر تمہید سے یہ غرض تھی کہ جنابِ زینبؑ و ام کلثومؑ داخلِ ذریاتِ رسالت مآب ہیں اور ان محترمات کی طرف بھی تمام وہ عزت و شرف راجع ہوتا ہے جو حسنینؑ کو حاصل تھا۔ چنانچہ اولادِ امام حسینؑ اور اعقابِ جنابِ زینبؑ میں علاماتِ سیادت مشترک تھے اور ہیں۔ مثلاً عمامہ سبز رنگ آج تک اولادِ فاطمہؑ کے لیے عرب و عجم و مصر میں طرۂ امتیاز ہے۔ اور گنبد سبز میں آرام کرنے والے سے تعلق خاص ظاہر کرتا ہے۔

مصر میں تو سلطنت بنی فاطمہؑ کے زمانے میں علامت سبز یا عمامۂ سبز اولادِ فاطمہؑ کے لیے مخصوص تھے کسی دوسرے سلسلے کا فرد اُنھیں قانوناً استعمال نہیں کر سکتا تھا۔ صاحب نور الابصار اس مقصد کو یوں واضح کرتے ہیں:

"جنابِ زینبؑ بنتِ علیؑ کا عقد اُن کے چچا زاد بھائی عبداللہ بن جعفرؓ سے ہوا، اُن سے چار فرزند ہوئے اور ایک دختر، جنابِ زینبؑ کی اولاد ممالکِ اسلامیہ میں کثرت سے پائی جاتی ہے۔ علمائے اسلام اولادِ محترمہ کے شرف کے متعلق دس وجوہ سے کلام کرتے ہیں:

اوّل۔ وہ آلِ رسولؐ ہیں، اور بالاجماع داخلِ اہلبیتؑ اس لیے کہ اولادِ آنحضرتؑ مومنینِ بنی ہاشم و عبدالمطلب سے ہے۔

دوم۔ وہ آل و ذریتِ نبی ہیں (بالاجماع) اس لیے کہ انسان کی اولادِ دختری اُس کی آل و ذریت میں شمار کی جاتی ہے۔ کیونکہ اگر اولاد میں کوئی شخص کسی ایک کے لیے وصیت کرتا ہے، تو اُس کی اولادِ اناث بھی وصیت میں شامل ہو جاتی ہے۔

سوم - وہ بھی اولادِ حسنینؑ کے ساتھ نسبِ رسول اللہؐ میں شریک ہیں - نیز رسولؐ نے آلِ فاطمہؑ ہی کو اپنی ذات سے مخصوص کیا ہے - دوسری صاحبزادیوں کی اولاد کے علاوہ جن میں کوئی ایسا نہ تھا جو حسنینؑ کے مقابلے میں پیش کیا جائے -

چہارم - یہ کہ اصطلاحِ قدیم کے موافق اُن پر بھی لفظِ (اشراف) کا اطلاق ہوتا ہے -

پنجم - اُن پر بھی صدقہ حرام ہے - اس لیے کہ آلِ جعفر بھی آلِ ہاشم سے ہیں -

ششم - وہ بھی مشارکت ذوی القربیٰ کے مستحق ہیں -

ہفتم - صرف آلِ جعفر ہی برکۃ الحبش (جو مقبوضات حبش اسلام نے حاصل کیے) کے اوقاف کی آمدنی پانے کے مستحق ہیں، جو خاص کر آلِ حسنینؑ کو بھی نہیں ملی -

ہشتم - ساداتِ فاطمی کے لیے علامتِ سبز کی خصوصیت نہ تو کسی خبرِ قدیم سے ثابت ہے، نہ ازروئے سُنّت الٰ[illegible] صاحبِ دُرر الاصداف کی تحقیق کے مطابق ۷۷۳ھ میں سلطان اشرف بن شعبان نے جو ترکوں کے دورِ حکومت میں

والیٔ مصر تھا، حکماً ساداتِ فاطمی کے لیے علامتِ سبز کو لازم قرار دیا۔ رہا عمامۂ سبز اُس کو محمد تشریف پاشاہی مصر نے ۱۲۸۰ھ میں مظاہرۂ غلافِ کعبہ کے متبرک موقع پر رائج کیا۔

غلافِ کعبۃ اللہ

دُنیاے اسلام واقف ہے کہ یومِ حج سے کچھ روز قبل سلطنتِ مصر کی جانب سے پوشش کعبہ ایک معزز وفد کے ہمراہ مکہ معظمہ بھیجی جاتی ہے، جس سے یوم الحج تجدیدِ غلافِ کعبہ کی رسم ادا ہوتی ہے، تین بار اس محمل کا مظاہرۂ عام دارالسلطنت مصر (قاہرہ) میں کیا جاتا ہے۔

قبل اس کے کہ اس متبرک پوشش کا محمل مکہ معظمہ روانہ کیا جائے، تین مرتبہ منظرِ عام پر لایا جاتا ہے:

اوّل۔ سامانِ پوشش کی خرید کے بعد جب وہ مسجد میں براے تیاری و زرتزیں کاری پہنچایا جاتا ہے۔ دوسرے جب تیار ہو جاتا ہے تو محمل پر رکھ کے گشت کرایا جاتا ہے۔ تیسرے جس روز خانۂ کعبہ روانہ کیا جاتا ہے، تو جلوس کے ساتھ ایک میدان میں لایا جاتا ہے۔ جہاں والیٔ مصر

اپنے شاہی خیمے میں مع عائدین و ارکین سلطنت منتظر رہتا ہے۔ لکھا ہے کہ اس پوشش پر اس قدر نفیس اور بیش قیمت زری کا کام ہوتا ہے کہ جب اُس پر سورج کی کرن پڑتی ہے تو دیکھنے والے کی نظر نہیں ٹھہرتی، اور خیرہ ہو جاتی ہے۔ جب یہ محمل شاہی کیمپ کے سامنے آ کے رُکتا ہے تو والیٔ مصر مع ارکین خیام شاہی سے نکل کے استقبال کرتا ہے اور سلامی دیتا ہے، پھر ریشمی مہارِ شتر خود اپنے ہاتھ میں لے کے چند قدم چلتا ہے اُس کے بعد وہ قافلہ راہِ حجاز پر ہوتا ہے۔

اسی جلوس کے موقع پر والیٔ مذکور نے سادات کو حکم دیا تھا کہ سبز عمامہ زیب سر کر کے محمل کے آگے آگے رہیں، یہ رسم اُس وقت سے اب تک جاری ہے اور عالم اسلام میں مشہور۔ ایک انگریز سیاح نے لکھا ہے کہ کچھ فقیر سبز چھینٹیں سر پر باندھے ہوئے محمل کے آگے آگے چلتے ہیں۔ یہ وہی مفلوک الحال ساداتِ فاطمی ہیں جن کا ذکر کیا جا رہا ہے۔

ساداتِ فاطمی کے لیے عمامۂ خضرا کی خصوصیت امتیازی کی وجہ یہ ہے کہ سیاہ لباس شعارِ بنی عباس ہے۔ زرد لباس شعارِ یہود۔ کرنجوا شعارِ نصاریٰ اور سرخ خلفاء فیہم۔

ساداتِ فاطمی اور خصوصیتِ لباسِ سبز کے بارے میں جابر بن عبداللہ اندلسی (صاحب شرح الفیہ) نے ایک قطعہ لکھا ہے۔ جو بہت مشہور ہے:

جَعَلُوا لِاَبْنَآءِ الرَّسُوْلِ عَلَامَۃً ۔ اِنَّ الْعَلَامَۃَ شَاْنُ مَنْ لَّا یَشْتَہِرْ

لوگوں نے آلِ رسولؐ کیلیے ایک علامت قرار دی ہے، لیکن علامت تو اُسے زیبا ہے جو مشہور نہ ہو۔

نُوْرُ النُّبُوَّۃِ فِیْ وَسِیْمِ وُجُوْہِہِمْ ۔ یُغْنِی الشَّرِیْفَ عَنِ الطِّرَازِ الْاَخْضَرِ

اُن کے چہروں پر تو نورِ رسالت چمکتا ہے، جو اُنہیں علامتِ سبز سے بے نیاز کرنے کو کافی ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ نشانِ سبز یا عمامۂ سبز کو آلِ رسولؐ کے تمام سلسلے والے استعمال کر سکتے ہیں۔ عام اس سے کہ وہ اولادِ حسنینؑ سے ہوں، یا نہ۔ اور اصل تو یہ ہے کہ لباسِ سبز کے استعمال کی کسی کے لیے ممانعت نہیں جس کا جی چاہے استعمال کرے۔ لیکن اگر اس علامت کے اظہار کی کوئی غرض شرعی ہے تو اُس وقت آلِ رسولؐ ہی کی خصوصیت متصور ہوگی۔

نہم و دہم۔ آیا اولادِ جنابِ زینبؑ اُس وقف یا

وصیت کے ذیل میں آسکتی ہے جو اشراف وسادات فاطمین کے لیے کیے گئے ہوں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ اگر وصیت کرنے والے یا وقف کرنے والے نے کوئی ایسی توضیح کر دی ہے، جس کی رو سے وہ اس میں داخل ہو سکتے ہوں یا نہیں۔ تو اس صورت میں تو پابندی لازمی ہونی چاہیے۔ ورنہ نہیں۔ آلِ حسنینؑ اور آلِ زینبؑ دونوں اُس سے مستفید ہو سکتے ہیں۔ لیکن عہدِ سلطنتِ فاطمین سے ابتک مصر میں یہ دستور چلا آرہا ہے کہ لفظِ شریف کا اطلاق صرف اولادِ حسنؑ و حسینؑ ہی پر ہوتا ہے۔ قولِ جلال الدین سیوطی جس پر دال ہے:
وَتَخْصِيصُ الشَّرَفِ بِآلِ عَلِيٍّ فَقَطْ اصْطِلَاحٌ لِأَهْلِ مِصْرَ خَاصَّةً (نور الابصار)

اولادِ جنابِ زینب بلاشبہ داخلِ ذریتِ رسولؐ ہیں، جس طرح اولادِ حسنینؑ۔ اور اُن پر بھی لفظِ شریف کا اطلاق علاوہ اور دلائل کے خطبۂ نکاحِ جنابِ فاطمہؑ کے حصۂ آخر سے ہوتا ہے، جو رسول اللہ نے وقتِ مناکحت علیؑ و فاطمہؑ ارشاد فرمایا تھا، جس کے موثق راوی انس بن مالک ہیں۔ "فَجَمَعَ اللّٰهُ شَمْلَهُمَا وَبَارَكَ لَهُمَا

وَاَطَابَ نَسْلَهُمَا وَجَعَلَ نَسْلَهُمَا مَفَاتِیْحَ الرَّحْمَةِ وَمَعَادِنَ الْحِكْمَةِ وَاَمْنَ الْاُمَّةِ۔ اللہ نے اُن دونوں کو متحد فرمایا۔ اور اُن کے لیے یہ رشتہ مبارک قرار دیا۔ اُن کی نسل پاک و پاکیزہ قرار دی، اور اُس کو رحمت کی کنجیاں "حکمت کی کانیں" اور اُمت کے لیے امن قرار دیا۔ ساقیٔ کوثر کو دعا دیکے فرمایا: "تم دونوں سے کثیر تعداد میں پاک اولاد ہوگی"۔

حضرتِ انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں وَاللّٰہِ لَقَدْ اُخْرِجَ مِنْهُمَا الْكَثِيْرُ الطَّيِّبُ۔ خدا کی قسم ویسا ہی ہوا جیسا رسولؐ نے فرمایا تھا۔

سادات اور سیدانیاں یہ عبارت پڑھ کے خوشی کے مارے پھولوں نہ سمائیں گی۔ اور حقِ بجانب بھی ہیں۔ مگر اس کے بعد اُنھیں تھوڑی دیر سنجیدگی سے غور کرنا پڑے گا کہ کیا حقیقتاً ہم اس کے مستحق ہیں۔ کتنے سادات علیٔ مرتضیٰؑ کے کردارِ حسنہ کی پیروی کرتے ہیں، اور کتنی محترمات جنابِ سیدہؑ و جنابِ زینبؑ کی زندگی کو اپنے عمل کے لیے نورانی نمونہ بناتی ہیں؟

اطاعتِ پدر

کوفے میں علی بن ابی طالبؑ کے ایک سال بعد جنابِ زینبؑ بھی آگئیں۔ کسی عید کے موقع پر کوفے کے شریف خاندانوں کی خواتین نے آنجناب کی خدمت میں درخواست کی کہ ہم سب ثانیٔ زہرا جنابِ زینبؑ کی خدمت میں شرف اندوز ہونا چاہتے ہیں، سنا ہے کہ علم و فضل میں اس وقت اپنی آپ ہی نظیر ہیں۔ اُن کی خواہش قبول فرمائی گئی" اور جنابِ زینبؑ کو مطلع کر دیا گیا۔ (یاد رہے کہ اس وقت جنابِ زینبؑ دار الخلافہ میں شاہزادی کی حیثیت رکھتی تھیں)

جنگِ نہروان کے مالِ غنیمت میں ایک بیش قیمت موتیوں کا ہار بھی علوی سپاہیوں کے ہاتھ آیا تھا۔ خود تو کیا لیتے کیونکہ علی بن ابی طالبؑ کی زنجیرِ اطاعت زیبِ گلو تھی۔ داخلِ بیت المال کر دیا۔ جنابِ زینبؑ کو اس ہار کے آنے کا علم تھا۔ چنانچہ اس موقع پر اُنھوں نے خازنِ بیت المال کو ایک تحریر بھیج کر عاریۃً منگوا لیا اور صبحِ عید قبل اس کے کہ خواتین کوفہ ملاقات کے لیے حاضر ہوں۔ جنابِ زینبؑ

لباسِ فاخرہ سے مزین ہو کے تیار ہوگئیں۔

اُس دیانت دار باپ نے (جو اپنی ذاتی ضرورت کے لیے بیت المال کے صرف سے جلتا ہوا چراغ گل کر دیتا تھا) کن انکھیوں سے پیاری بیٹی کی طرف دیکھا۔ کچھ کہا تو نہیں، لیکن دولت سرا سے باہر تشریف لے آئے۔ قنبر سے فرمایا: "ابن ابی رافع (خازن بیت المال) کو بلاؤ" وہ طلبی کی غرض سمجھ گئے۔ اور رقعۂ جنابِ زینبؑ بھی ہمراہ لیتے آئے۔ ارشاد ہوا "یہ تمنے کیا کیا؟"

اُنھوں نے جواب کی بجائے چپکے سے تحریر مذکورہ پیش کر دی۔ علیؑ مرتضیٰ نے پڑھی، خاموش ہوگئے۔ چونکہ رسولؐ کے امانت دار تھے، پسند نہ آیا۔ بعض کے نزدیک حکم دیا کہ آج ہی بیت المال میں واپس کر دیا جائے۔ کیونکہ مہاجرین و انصار کی بیٹیاں بھی عید کے روز اسی طرح زیب و زینت کا سامان چاہتی ہونگی۔ جنابِ زینبؑ نے اطاعت خم کر دیا۔

جنابِ زینبؑ شاملِ ثقات ہیں

جن معزز خواتین سے اصحابِ خبر نے وثوق کے ساتھ احادیثِ نبویؐ نقل کی ہیں وہ ازواجِ رسول ہیں سے

یہ ہیں: جناب خدیجہؓ جن سے صرف (۱) حدیث مروی ہے۔ جناب عائشہؓ جن سے (۱۲۱۰) جناب میمونہؓ جن (۷۶) جناب اُم سلمہؓ جن سے (۳۲۸) احادیث مروی ہیں وغیرہا۔ زنان اہلبیت سے اول جناب فاطمہ زہراؑ دخترِ رسولؐ پھر اُن کی نواسی جناب زینبؑ ہیں

(تلخیص البخاری کتاب الرجال)

ابن عباس جن کا شمار اکابر علمائے اولین میں ہے جب کسی حدیث کو جناب زینبؑ کی سند سے پیش کرتے ہیں تو لکھتے ہیں: حدثتنی عقیلتنا زینب بنت علی کذا وکذا (میں نے عقیلۂ بنی ہاشم زینبؑ سے ایسا ایسا سُنا تھا)

جناب زین العابدینؑ کی بھی یہی حالت تھی۔ جب حادثۂ کربلا کے کسی حصے کو وثوق کے ساتھ بیان کرنا چاہتے تھے تو پہلے فرما دیتے تھے: سمعت من عمتی زینب (میں نے اپنی پھوپی زینبؑ سے یہ سُنا ہے) ٹھیک ہے وہ غریب تو بیمار تھے جزئیات پر نظر رکھنے کا ہوش کہاں تھا؟

منجملہ اور احباب کے کامل الزیارۃ کی خبر ہے جو علامۂ

مجلسی نے بحار الانوار کی جلد ہشتم و دہم میں جنابِ زینبؑ کے حوالے سے یوں لکھی ہے: عن زائدہ عن زین العابدین عن زینب عن اُم ایمن عن رسول اللہ صلعم۔ دوم خبرِ خطبۂ فدک ہے، جو جلد ہشتم باب فدک میں یوں نقل ہے۔ "عن احمد بن محمد بن جابر عن زینب بنت علیؑ۔ علاوہ ان اسناد حدیث کے اور متعدد حدیثیں ہیں جو جنابِ زینب کے حوالے سے ملتی ہیں۔ بوجہ طوالت نظرانداز کی جاتی ہیں۔ غرض یہ کہ جنابِ زینبؑ کی ذات اعزا اور قدرشناس افرادِ اُمت میں محلِ وثوق رہی۔ حتیٰ کہ بعدِ وفات محترمہ یہ سلسلۂ احترام اب تک جاری ہے۔ اور قیامت تک روایاتِ اہلبیتؑ کے ساتھ جاری رہے گا۔

فصاحت و بلاغت

بلاغتِ کلام و فصاحتِ بیان دونوں ایسے ملکے ہیں جو بڑے بڑے مقررین میں بھی نہیں پائے جاتے۔ البتہ فطرت کی طرف سے جن مقررین کو یہ نعمت عطا ہوئی ہے، اُنکی جادو بیانی کا کیا ذکر۔

ایک ایسا عالم و فاضل انسان جو علومِ رسمیہ میں کافی دستگاہ رکھتا ہو۔ علمِ کلام کے شئونات سے بھی واقف ہو۔ یہ ضروری نہیں کہ اُس کی تقریر میں ملکاتِ مذکورہ بھی پائے جائیں۔ بے شک اگر وہ کسی بحثِ علمی پر گفتگو کرے تو معلومات کے دریا بہا دے۔ نکاتِ علمیہ کے ذخیرے فراہم کردے۔ لیکن اگر اُس کی تقریر مذکورۂ بالا کسی ایک ملکے کے ماتحت نہیں تو سامعین کی جاذبیتِ خیال غیر ممکن۔ اگر کسی میں صرف بلاغت ہی بلاغت پائی جاتی ہے، تو بھی خواص سے قطعِ نظر کرتے ہوئے سماعتِ عامہ پر بہت کم اثر ہوتا ہے۔ اُس کے مقابلے میں ایک فصیح مقرر خواص و عوام دونوں کو محظوظ کرسکتا ہے۔

منبرِ عقیدت پر ہمارے سامنے نظم و نثر دونوں کی قریب تر مثالیں موجود ہیں۔ نظم مرثیہ میں " انیس و دبیر۔ مقررینِ عقیدت میں مولوی سید سبط حسن صاحب مغفور اور مولوی سید محمد رضا صاحب مرحوم (شمس پوری)

انیس و دبیر کے دیکھنے والوں کو آپ نے یقیناً دیکھا ہوگا۔ اور موخر الذکر مقررین کو تو آپ نے شاید خود بھی سُنا ہو۔

خود اندازہ کر لیجیے کہ مربیتِ عاقلہ کسے حاصل تھی۔ سچ تو یوں ہی ہے، جیسا امیرالمومنین علی بن ابی طالبؑ نے ارشاد فرمایا: "نِعمَ النّاصِرُ جوابُ الحاضرُ" جواب کی برجستگی بڑی چیز ہے۔ واقعی اُسی شخص کو موقع کی سوجھتی ہے، جو فطرتاً ذکی و ذہین ہوتا ہے۔

جنابِ زینبؑ کی فصاحتِ کلام اور بلاغتِ بیان کے ایسے لوگ شاہد ہیں جنھوں نے اُن کو اپنی مودب آنکھوں سے دیکھا، اور اُن کے کلام کو مشتاق کانوں سے سُنا۔ یہ کوئی کہانی نہیں ہے جو گھڑی گئی، کسی نے مانی کسی نے نہ مانی۔ ایک ایرانی کہتا ہے:

تکلم کرد نش ہر کہ دید فاش می گفتے

زبانِ حیدری گویا کہ دہطِ لسانِ اُرد

(جو شخص جنابِ زینب کی تقریر سُنتا تھا، کہہ اُٹھتا تھا کہ بلاشبہ اُن کی زبان میں علی بن ابی طالبؑ کی لہک موجود ہے۔)

اشعار و خطباتِ جنابِ زینبؑ واقعۂ کربلا سے پہلے نہیں پائے جاتے۔ جس طرح جنابِ فاطمہؑ کے اشعار صرف تعزیتِ رسول اللہؐ میں پائے جاتے ہیں، اُن کے سوا کچھ نہیں۔ یا

اسی قبیل کے اور دو چار اشعار۔ مثلاً:

مَاذَا عَلٰی مَنْ شَمَّ تُرْبَةَ اَحْمَدٍ ۔۔۔ اَنْ لَّا یَشُمَّ مَدَی الزَّمَانِ غَوَالِیَا

(اللہ جانے یہ کیا بات ہے، جس نے خاکِ تُربتِ احمدؐ سونگھ لی مدّت العمر دُنیا کی کوئی خوشبو لینا نہیں چاہتا۔)

صُبَّتْ عَلَیَّ مَصَائِبُ لَوْ اَنَّهَا ۔۔۔ صُبَّتْ عَلَی الْاَیَّامِ صِرْنَ لَیَالِیَا

(وفاتِ پدر سے مجھ پر مصیبتوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اگر وہ دنوں پر نازل ہوتیں تو سیاہ راتوں میں تبدیل ہو جاتے۔

جنابِ زینبؑ کے ارشادات میں صرف شکایت آمیز حُزن و ملال یا افتخارِ خاندانی کے اظہار کے سوا کوئی دوسری چیز نہیں ملتی جو عرب کے کسی تمدّنِ خاص پر روشنی ڈالتی ہو۔ یا شاعرانہ فطری نزاکتوں کی حامل ہو۔ ہاں ایک خصوصیت ضرور ہے، جو اُن کے قلم و دماغ میں ہونی لازمی تھی۔ وہ کیا؟ وہ صحیح احکامِ خدا و رسولؐ کے اثرات، جلالتِ خداوندی، عظمتِ نبویؐ اور شانِ امامت کا صحیح مفہوم (ماحول ہی ایسا تھا) مگر جو کچھ کہا ہے وہ فصاحت و بلاغت کی کسوٹی پر کھرا اُترتا ہے۔ اس میں مکالمہ ہو یا فی البدیہہ نظم ہو یا نثر

اگرچہ عرب کی شاعری عام طور سے سچے واردات نفسانی،

فخرِ ذاتی و خاندانی سے مملو ہے، حتیٰ کہ مرثیہ بھی مرنے والے کے اوصافِ بشری کا مرقع ہوا کرتا ہے، جن کے فقدان پر صحیح ماتم کیا جاتا ہے۔ مرحوم کی لایعنی مدح سرائی نہیں ہوتی۔

مرثیہ زینب بنت الطثریہ
اپنے مقتول برادر کے غم میں

(یہ عنوان حضرت ناصر الملۃ کی توجہ خاص کا ممنونِ احسان ہے)

اس خاتونِ عرب کا ذکر میں نے اس سے قبل کیا ہے اور ناظرین سے یہ وعدہ بھی کیا تھا کہ آگے کسی موقع پر اس شاعرۂ عرب اور جنابِ زینبؑ کے جذبات مرثیۂ برادر کا تقابل پیش کروں گا۔ جس سے دو ہمنام خواتینِ عرب کا مفہوم مرثیہ سے صحیح تعلق کا اندازہ ہو جائے۔ چنانچہ کہتی ہے:

ارٰی الاثل من بطن العقیق مجاوری
مقیما وقد غالت یزید غوائلہ

(میں دیکھتی ہوں کہ وسطِ وادی عقیق میں مضبوط چنار کے بے ضرر درخت کھڑے ہیں۔ لیکن میرا سرو قد بھائی وہاں قتل ہو گیا)

درخت اثل کی جڑ بہت مضبوط ہوتی ہے۔ جبھی تو ریگستان میں

جمار ہتا ہے۔ شاعرہ نے اپنے بھائی (یزید) کی پامردی کی طرف لطیف اشارہ کیا ہے۔

فَتیً قَدَّ قدَّ السیف لا متضائلُ
ولا رحِلٌ لَبّاتہ و اباجلہ
(وہ سیف قد تھا ٹھنگنا نہیں تھا۔ نہ اُس کا سینہ اور پہلو جھکے ہوئے تھے۔ خلاصہ یہ کہ ایک لمبا، اور چوڑا چکلا گبرو جوان تھا۔)

اذا انزل الاضیاف کان غذوراً
علی الحی حتیٰ تستقلَّ مراجلہ
(ایسا مہمان نواز تھا کہ جب مہمان آجاتے تھے تو ملازموں سے سخت گیری کرتا تھا جب تک دیگیں چولھے پر چڑھ نہ جائیں) یا پورے قبیلے پر گرم ہو جاتا تھا۔

مضیٰ وَوَرِثنا دَرِیسَ مفاضۃً
وابیضَ ھِندیاً طویلاً حماٸلہ
(وہ بہادر داد شجاعت دے گیا۔ ایک پرانی زرہ ہمیں میراث میں ملی اور ایک ہندی سیف جس کی حمائل دراز تھی۔)

وقد کان یُروی المشرفیَّ بکفہ
وَیَبلغُ اَقصیٰ حجرۃِ الحیّ نائلہ
(اپنے ہاتھ سے اُس سیف کو خون سے) سیراب کرتا تھا، اور دُور دُور کے قبائل میں

اُس کی شجاعت کے ڈنکے بجتے تھے۔

کریمٌ اذا لاقیتہٗ متبسّماً
واِمّا تولّٰی اشعث الراس جافلہ

(ایسا سخی کہ جب لوگ خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔ اگر واپس ہوتا تو ذاتی معاملات کی اُلجھنوں میں مصروف ہوجاتا)

اذا القوم اَمّوا بیتہٗ فہو عامدٌ
لِاَحسَنِ ماظنّوا بہٖ فھو فاعِلہٗ

(اگر لوگ اُس کے گھر آ کے استمداد کرتے تھے تو وہ تیار ہوجاتا تھا اور گمان سے کہیں زیادہ کر گزرتا تھا)

وکنتُ اُعیرُ الدّمعَ قبلکَ من بکٰی
وانتَ علیٰ من مات قبلکَ شاغلہٗ

(مُردوں پر ایسی رونے والی کہ لوگ مجھے دیکھ دیکھ کے رویا کرتے تھے۔ مگر تیری موت نے تو اُن سب کو بھلا دیا)

فتی السِّنِ کہل الحلم تسبدلہٗ بنانہٗ
وسیعٌ۔ وکفاہ النّدیٰ، وانا ملہٗ

(تھا تو جوان عمر مگر بڈھوں کا سا حلم رکھتا تھا۔ اُس کی سخاوت کو نہ پوچھو پوری پوری سخی تھی)

(حماسہ۔ باب المراثی)

مرثیۂ زینبؑ بہ غمِ حسینؑ

فَمَهْلًا اخی قبلَ المماتِ هُنَیئةً
لِتَبْرَدَ مِنّی لَوعةٌ وغلیلُ

ماں جائے! قبلِ مرگ ذرا ٹھہر جاؤ کہ آتش قلب تمہارے دیدار سے ٹھنڈی ہو لے۔ (یہ شعر وقتِ رخصتِ آخر فرمایا تھا)

علی الطفِّ السَّلامُ وساکنیهِ
وروحُ اللهِ فی تلکَ القبابِ

کربلا اور اُس کے ساکنوں پر سلام ہو۔ اور اُن پر رحمتِ خدا ہو جو ان قبروں میں مدفون ہیں۔

مضاجعُ فتیةٍ عبدوا وناموا
هجوعًا فی الفدافدِ والشِّعابِ

اُن نوجوانوں نے حق عبادت ادا کرکے استراحت کی۔ اور جب نیند کا جھونکا آیا تو پہاڑ اور گھاٹیوں میں سو گئے۔

عَلَتْهُم فی مضاجعِهِم کِعابٌ
بأوراقٍ مُنَعَّمَةٍ رِطابِ

(ایسے پیاسے) کہ حورانِ جنت نے اُنھیں مزاروں میں آکے سیراب کیا۔ نفیس اور تر و تازہ انگوروں سے۔

وصُیِّرَتِ القبورُ لهُم قصورًا
مُناخًا ذاتَ أفنیةٍ رِحابِ

یہ قبریں اُن کے آرام کے محل بن گئیں = اور ایسی منزل جو وسیع و کشادہ ہے۔

لَئِن وَارَتهُم اطباقُ اَرضٍ　　کما اُغمِدتَ سیفاً فی قِرابٍ

اگر اُنھیں پردہ پوش زمین نے پنہاں کر دیا۔ تو ایسا سمجھو جیسے میان میں تلوار رکھدی۔

فقد نقلوا الیٰ جنّاتِ عَدنٍ　　وقد عیضوا النعیم من العذابِ

نقلِ مکان کرکے وہ جنت میں پہنچ گئے۔ تکالیف دُنیا کے عوض اُنھیں نعماتِ خلد عطا ہوئے۔

فلی قلبٌ علیہ ذو التہابٍ　　ولی جفنٌ علیہ ذو انسکابٍ

جدائی حسینؑ میں میرے دل سے شعلے نکل رہے ہیں۔ اور آنکھوں سے اشکوں کی بارش ہو رہی ہے۔

ان دونوں مرثیوں میں جو بات قابلِ غور ہے وہ یہ ہے کہ زینب بنت الطثریہ کے اشعارِ غم میں حیاتِ برادر سے محروم ہو جانے کا ہر دردناک پہلو پایا جاتا ہے۔ نیز اُس کے اوصافِ بشری اور شجاعت و دلیری کا بہترین مظاہرہ کیا گیا ہے۔ لیکن اُن میں عقائدِ بعد الموت۔ اور سکونِ روحانی کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ وجہ یہ ہے کہ شاعرہ زمانہ جاہلیت سے تعلق رکھتی ہے، جس وقت اسلام کے تلقین کردہ برکاتِ روحانی کا وجود ہی نہ تھا۔

برخلاف اُس کے جناب زینبؑ کا ہر درد انگیز شعر شہدائی کے ذکرِ شجاعت وحمایتِ حق کے ساتھ ساتھ التذاذِ روحانی نعماتِ خُلد، اور جزائے خیر کا مظہر ہے۔ عقائدِ اسلام کے مطابق جن سے روحِ شہدا کو سکونِ ابدی میسر ہوا۔

خطبات

پہلا خطاب جو جنابِ زینبؑ نے، کوفے کے دارالامارۃ میں مجمعِ عام کے سامنے ابنِ زیاد ملعون (حاکمِ کوفہ) سے کیا ہے، اُس کے متعلق بشیر بن خزیم الاسدی چشم دید واقعہ حوالۂ قلم کرتے ہوئے یوں رائے ظاہر کرتا ہے:

وَنظرتُ الیٰ زینبؑ بنتَ علیؑ یومئذٍ۔ ولم ترخفرۃً قَطّ انطق منہا۔ کانھا تفرغ من لسان امیرالمومنین علی بن ابی طالب۔ وقد اَومئت الی النّاس اَن اسکتوا فارتدّت الانفاسَ وسکتِ الاجراس۔ ثم قالت اَلحمدُ للّٰہ والصلوٰۃ علی ابی محمدؐ والہ الطیبین الاخیار = الخ

"میں نے آج زینبؑ بنت علیؑ کی فصاحت خیز تقریر سنی۔ اس سے پہلے ایسی طرار وعرب عورت میری نظر سے نہیں گزری۔

جس نے اپنے مخالف کو ایسے دنداں شکن جوابات دیے ہوں۔ وہ کیا بول رہی تھیں گویا خود علی بن ابی طالب بول رہے تھے۔ انھوں نے جوں ہی مجمع کی طرف اشارے سے کہا۔ خاموش! فوراً سکوت چھا گیا حتیٰ کہ یزیدی نقاروں کی آواز بھی بند ہو گئی۔ اُن محترمہ نے حمدِ خدا کی۔ رسولؐ اور اُنکی آل پر صلوٰۃ بھیجی اور خطبہ شروع کر دیا۔"

اللہ اللہ! اس عالمِ گرفتاری و بے کسی میں۔ اور پھر ایک عورت ذات میں ایسی قوّتِ تصرف پیدا ہو جائے کہ دوست دُشمن سب پر ایک اشارے سے سکوت طاری ہو جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا؟

بظاہر اس کے دو وجوہ معلوم ہوتے ہیں۔ اوّل یہ کہ اُس سلسلۂ جلیلہ کی ایک قریبی کڑی تھیں۔ جہاں سے کمالات و تصرفاتِ روحانی کے دریا بہے ہیں۔ ممکن ہے کہ ماحول کے ناگوار اثرات سے متاثر ہو گئے روح میں ایک کیفیتِ جذب طاری ہو گئی ہو' جس کا دباؤ عوام کی غیر مرتاض ارواح پر پڑ گیا ہو۔ وہ تو سلطان الاولیا ہونے والے علی کی صاحبزادی تھیں۔ ایک منجھا ہوا بازی گر بھی تماشا دکھانے

وقتاً ہی قوتِ ارادی کے اثر سے مجمع کے حواسِ خمسہ کو اپنا تابع کرلیتا ہے اور جو اُس کی گھڑی وقت بتاتی ہے اُس کی موافقت سیکڑوں گھڑیاں کرجاتی ہیں۔ یہ کیا ہے؟ تصرف مجازی! حقیقت وہی جانیں جو اربابِ حقیقت ہیں۔

یا پھر بدیہی وجہ یہ ہے، کہ کوفے کے باشندے ایک مُدت تک علی بن ابی طالب کے فیوضاتِ روحانیہ اور خطباتِ علمیہ سے مستفیض ہوتے رہے۔ فطرتِ انسانی ہے کہ ایک فردِ کامل کے معدوم ہوجانے کے بعد اُس کے صحیح جانشین کی تلاش ہوتی ہے۔ آنکھیں ترستی ہیں، سامعہ گوش برآواز رہتا ہے کہ پھر وہی صدا آئے۔ مگر یہاں میدانِ خطابت میں نہ تو حسنؑ موجود تھے نہ حسینؑ۔ پھر عوام کس کے کلام سے لذت اندوز ہوتے۔ کہ یکایک کوفے کے دارالامارة میں اُس خطیبِ بے عدیل کی پیاری بیٹی زینبؑ تقریر کرنے کھڑی ہوجاتی ہے۔ حیرت انگیز نظریں اُٹھ جاتی ہیں۔ حاضرین پر سکوت چھا جاتا ہے۔ دو ہی ایک گوہر نثار جملوں کے بعد جب علی مرتضیٰؑ کی یاد تازہ ہونے لگتی ہے تو مجمع کے ایک گوشے سے کسی مردِ ضعیف کی گریہ آلود آواز

اس طرح بلند ہونے لگتی ہے :
بابی انتم و امی ھو لکم خیر کھول ونساءکم خیر نساء
(اے آلِ رسولؐ میرے ماں باپ تم پر قربان! تمہارے
مرد دنیا بھر کے مردوں سے افضل۔ اور تمہاری عورتیں
تمام عالم کی عورتوں سے بہتر ہیں)

قاعدہ ہے کہ بیٹا باپ سے مشابہ ہوتا ہے اور بیٹی ماں کے۔
سوائے جنابِ فاطمہؑ کے جن کی نسبت کہا گیا ہے :
کانت مشیتھا مشیتہ ابیھا رسول اللہ ومنطقھا
کمنطقہ (جنابِ فاطمہؑ کی چال ڈھال، بات چیت بعینہ
اپنے پدرِ بزرگوار رسولِ خداؐ کی سی تھی)

یا پھر اُسی سینے کی پروردش یافتہ جناب زینب ہیں اپنے
پدرِ عالی مقدار حیدرِ کرارؑ کے خصوصیات پائے جاتے ہیں۔
اہلِ کوفہ اُن کی تقریر سُن کے مبہوت نہ ہو جاتے تو پھر کیا
ہوتے :

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دشمنِ اسلام یزید اور اُس کے معاونین
کے استبداد و ظالمانہ طرزِ عمل پر ایک عورت نے نظرِ تنقید
ڈالنی فروغ کر دی تھی، جس کی جرأت اس وقت تک اکابرین

عرب کو بھی نہیں ہوئی تھی۔ لہذا حکومتِ وقت کے خلاف جنابِ زینبؑ کی یہ پہلی صدائے احتجاج تھی، جس نے عوام کے رجحانات اپنی طرف کر لیے۔

آج مسز سروجنی نائیڈو حکومت کے کسی قانون کی مخالفت کے لئے عرشۂ خطابت پر کھڑی ہو جائے تو بڑے بڑے سیاسی مردِ میدان وہ اثر نہیں پیدا کر سکتے، جو اُس کی نسائی شخصیت کر گزرے گی۔

قابلِ افسوس امر یہ ہے کہ آج مسلم خواتین میں مذہبی شوقِ علم ویسا نہیں جیسا ہونا چاہیے۔ خاص کر اُن دخترانِ اسلام کو تو ضرور توجہ کرنی چاہیے، جن کو آلِ رسولؐ سے نسبت ہے اُن کے سلفِ مکرم علیؑ مرتضیٰؑ فرما گئے ہیں:

رَضِینَا قِسمَۃَ الجَبَّارِ فِینَا — لَنَا عِلمٌ وَلِلاَعدَاءِ مَالٌ

"مرضیِ مولیٰ! ہم کو اُس نے دولتِ علم عطا کی، اور ہمارے مخالفین کو مالِ دنیا۔"

ایک سیّدِ عراق کی ندامتِ جہل۔

علامہ شیخ محمد باقر قائینی جو بڑے محدث، فقیہ اور عالمِ جلیل مانے جاتے ہیں اور جن کی مشہور تصنیف کبریتِ احمر ہے

اپنی تالیف کشکول میں لکھتے ہیں: "میں جس زمانے میں بغرض تحصیلِ علم نجفِ اشرف میں تھا مجھے یاد ہے کہ ایک روز ایک سیّد نجفی جن سے میں بخوبی واقف تھا، روضۂ شریفہ میں مشغولِ زیارت تھے۔ اسی درمیان میں ایک تُرک قرآن مجید لیے آیا۔ اور قریبِ قبرِ مطہر علی بن ابی طالبؑ تلاوت کرنے لگا۔ سیّد صاحب صرف سیّد ہی سیّد تھے، اور شرفِ علم سے بے بہرہ۔ اُس تُرک کو اپنے جد کی قبرِ مطہر پر قرآنِ مجید کی تلاوت کرتے ہوئے دیکھ کر ایسے نادم ہوئے کہ کاٹو تو لہو نہیں۔ اپنے دل میں کہنے لگے: ایسی سیادت کس کام کی جس کے ساتھ اجداد کی علمی وراثت نہو۔ ہم مدعی ہیں کہ قرآن ہمارے بزرگوں کے گھر میں نازل ہوا۔ مگر ہم کو اُس کا علم نہیں۔ اِس مبارک ساعت سے اُن حضرت میں احساسِ ندامت کے ساتھ تحصیلِ علم کا ایسا شوق پیدا ہوگیا کہ مصروفِ کتاب ہوگئے دن کا نصف حصّہ کسبِ معاش اور پرورشِ عیال میں صرف کرتے تھے، اور باقی طلبِ علم میں۔ پھر تو بہت جلد یعنی سال ہی دو سال میں وہ حجۃ الاسلام میرزا محمد حسن شیرازی کے حلقۂ درس میں بیٹھنے لگے۔ اُن کے احباب متحیر ہو کے کہتے تھے

اس شخص کی ترقیٔ علم اور اس قدر جلد! برکت سیادت ہے اور اللہ کی دین۔ حتیٰ کہ کچھ عرصے کے بعد اُن کے متعلق درجہ اجتہاد کا گمان ہونے لگا۔" نوجوان سیدوں اور سیدانیوں کو سبق لینا چاہیے۔

مہمان سے برتاؤ

قومِ عرب کے ذکر کے ساتھ کسی دوسری قوم کی مسافر نوازی اور مہمان داری کا ذکر ایسا ہی ہے جیسے سورج کے سامنے پھلجھڑی چھوڑ دی۔ تمدّنِ عرب میں بالکل درست لکھا ہے کہ قومِ عرب ضیافتِ انسانی کی جیتی جاگتی تصویر تھی۔ مہمانوں کے لیے جان دیدینا وہ اپنے لیے طرۂ امتیاز سمجھتے تھے۔ عرب نے حاتمِ طائی جیسا سخی پیدا کیا جس کی مثال دنیا کی تاریخ نہیں پیش کر سکتی۔ بنی ہاشم تو جود و سخا میں مشہور تھے ہی۔ مگر رسولِ ہاشمی و مطلبی نے پیدا ہو کے اپنے خاندان کے اوصافِ جمیلہ کا جھنڈا ایسا بلند کر دیا۔ کہ انقلاباتِ اقوام سے الگ اُس کا پرچم ہمیشہ عالمِ تمدّن میں لہراتا رہے گا۔

غربت کدۂ علیؑ مرتضیٰ، نعمتکدۂ حسنؑ مجتبیٰ اور مظلوم کدۂ

حسینِ گلگوں قبا پر تو رات دن مہماں نوازیاں ہوتی ہی رہتی تھیں، جن کے انصرام و اہتمام میں جنابِ زینبؑ کا پیش پیش رہنا لازمی تھا۔ وہ تو سیکا تھا، جو کچھ کرتیں کوئی ہاتھ روکنے والا نہ تھا۔ رَبّ العزّت نے سُسرال بھی ایسی سخی مرحمت کی کہ اُن کے جود و کرم کے ماحول میں ذرا بھی فرق نہ آیا۔ حتیٰ کہ سفر اور حضر دونوں اُن کے لیے اس معاملے میں یکساں تھے۔ چنانچہ جب مکّہ مکرّمہ سے امام حسینؑ مع عیال عراق کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں زہیر قین بجلی اُن کے ساتھ ہو گئے۔ یہ اپنے قبیلے کے معزز تھے۔ زوجہ بھی ساتھ ہولیں۔ اسی طرح بہت سی انصار کی عورتیں تھیں۔ جنابِ زینبؑ نے اس عالمِ غربت میں بھی سب کی خاطر ہر طرح ملحوظ رکھی۔

جنابِ زینبؑ نے اعدا کی کثرت اور حسینؑ کے معاونین کی قلت پر نظر کر کے بھائی کو مشورہ دیا کہ تم بھی اپنے دوستوں کو بلا لو۔ چنانچہ امام حسینؑ نے اپنے بچپنے کے دوست حبیب بن مظاہر کو کوفے خط لکھا۔ وہ فوراً کربلا آ گئے۔ جنابِ زینبؑ کو جب اُن کے آنے کی خبر ہوئی تو اُن کو

سلام کہلا بھیجا۔ حبیب نے اس اعزاز کو اپنے لیے سرخروئی وعزتِ آخرت کا وسیلہ سمجھا۔

اسی طرح حُر بن یزید ریاحی۔ جو لشکرِ یزید کا ایک رسالدار تھا۔ اور حسینؑ کو کوفے کی طرف لانے کے لیے متعین کیا گیا تھا۔ دسویں محرم کو امام سے آملا۔ جنابِ زینبؑ بہت خوش ہوئیں اور ایک رومال جو جنابِ فاطمہؑ کا تھا، حُر کو تحفتہً بھیجا۔ ناسخ التواریخ میں لکھا ہے کہ یہ رومال حُر نے اپنے گلے کے زخم پر وقتِ جنگ باندھ لیا تھا۔ اور جب شاہ اسمٰعیل صفوی کے اصرار سے بغرض تحقیقِ حیاتِ شہدا، اُس شہید کا ایک تختۂ قبر سرکایا گیا۔ دیکھا کہ کفن خونچکاں ہے اور گلے میں ایک سفید رومال بندھا ہے ؎

اس خونچکاں کفن میں ہزاروں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پہ حور کی

دشتِ کربلا کے اس پہلے سنتری نے دنیا بھر کے شہدائے راہِ خدا کی طرف سے امتحان دے کے اُن کے بقائے دوام کی سند پیش کر دی:

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق
ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

جس وقت جنابِ حُر زخمی ہو کے گھوڑے سے گرے تو امام حسینؑ کو جنابِ زینبؑ نے فوراً خبر گیری کی طرف توجہ دلائی اور بہت محزون ہوئیں۔ اس تعزیتِ مہمان کو انیس نے جنابِ زینبؑ کی زبانی یوں نظم کیا ہے:

میں پیٹنے کو لاشۂ مہماں پہ آؤں گی
میں اُس کے واسطے صفِ ماتم بچھاؤں گی

بھائی سے اُلفت

اوپر لکھا جا چکا ہے کہ جنابِ زینبؑ امام حسینؑ سے بہت محبت کرتی تھیں، اور آنجناب بھی اُنھیں جنابِ فاطمہؑ کی جگہ سمجھتے تھے۔ لیکن محبتِ خواہر و برادر کا کوئی خاص معیار قائم نہ تھا۔ اصلی محبت وہ ہے جو عمل کی کسوٹی پر پوری اُتر سکے۔ چنانچہ جب مکّے سے سفرِ عراق کا ارادہ فرمایا تو اعزائے قریب کو اطلاع ہوئی۔ محمد بن حنفیہ اُن کے علاتی بھائی، عبداللہ بن جعفر اُن کے بہنوئی سبھی تو آئے اور اس ارادے سے باز رکھنے کی کوشش

کی۔ اسی سلسلے میں اُن کے چچا عبد اللہ بن عباس بھی آئے اور ترکِ مدینہ کے خلاف اصرار کیا۔ جب دیکھا کہ حسینؑ کسی طرح مانتے ہی نہیں، تو کہا: "حسینؑ اگر تم سوئے ہلاکت جا رہے ہو تو ان خواتینِ اہلبیت کو اپنے ساتھ کیوں لیے جاتے ہو؟ انھیں یہیں رہنے دو۔"
یہ بات جنابِ زینبؑ کو ناگوار ہوئی اور فرمایا: "اے ابنِ عباس آپ ہمارے والی وارث کو یہ مشورہ دیتے ہیں کہ وہ ہمیں تنہا چھوڑ جائیں۔ بخدا ہرگز ایسا نہیں ہو سکتا۔ ہماری موت و زیست اُن کے دم سے وابستہ ہے۔ اگر اُن کے دُشمن دُنیا میں نہ رہنے دیں تو پھر ہم کس کے ہو کے رہیں گے۔"؟

اطاعتِ شوہر

جنابِ زینبؑ نے جب اچھی طرح سمجھ لیا کہ امامؑ کو اُن کے ارادۂ حرکت سے کوئی روکنے والا نہیں۔ چاہے ادھر کی دُنیا اودھر ہو جائے وہ ضرور تشریف لے جائیں گے۔ تو خود بھی اپنے شوہر عبد اللہ بن جعفر کے پاس بہانے اجازت آئیں۔ مُنھ سے تو کچھ نہیں بولیں

ہاں زار و قطار رونے لگیں۔ شوہر نے سببِ گریہ پوچھا تو کہنے لگیں کہ آپ کو معلوم ہے میرے ماں جائے حسینؑ نے سفرِ عراق کا ارادہ کر لیا ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ مجھے اُن سے اور اُنھیں مجھ سے کس قدر اُنس ہے۔ میں بھی ساتھ جاؤں گی، آپ کی اجازت چاہتی ہوں۔ اگر نہ دیجیے گا تو خیر نہ سہی۔ مگر یہ ملحوظ رہے کہ بغیر اُن کے میرے جینے کے لالے پڑ جائیں گے۔

جنابِ عبداللہ یہ سُن کے آبدیدہ ہو گئے اور فرمایا: بسر و چشم! حسینؑ کے معاملے میں اور میری طرف سے انکار! جنابِ زینبؑ اس جواب سے مسرور ہوئیں، گویا جان میں جان آ گئی۔

سفرِ کربلا اور ایک غیبی آگاہی

المختصر قافلۂ حسینی کے کوچ کا دن آ گیا۔ عزیز و اقارب رُخصت کے لیے منزلِ حسینؑ پر جمع ہو گئے۔ جو ہوا سو ہوا۔ مکے سے چل کر جب منزلِ خزیمہ پہنچے تو ایک شبانہ روز قیام کیا۔ صبح کو جنابِ زینبؑ بھائی کے پاس آئیں اور کہا: "بھیا! شب گزشتہ عجیب کلام سے میرے گوش آشنا ہوئے"۔ امام حسینؑ

بڑے اطمینان سے پوچھتے ہیں: "بہن کیا بات ہے" جیسے پہلے ہی سے جانتے تھے۔ بہن نے کہا: "میں نے آدھی رات کے وقت کسی کو یہ اشعار پڑھتے سُنا، معلوم نہیں کس کی طرف اشارہ ہے!

اَلَا یَا عَیْنُ فَاحْتَفِلِیْ بِجُھْدٍ وَمَنْ یَّبْکِیْ عَلَی الشُّھَدَاءِ بَعْدِیْ

اے آنکھ جتنا رو سکتی ہے رولے۔ بعد کو شہیدوں پر کون روئیگا؟

عَلٰی قَوْمٍ تَسُوْقُھُمُ الْمَنَایَا بِمِقْدَارٍ اِلٰی اِنْجَازِ وَعْدٍ

اُن پر، جن کو موت مقامِ موعودہ پر لیے جاتی ہے۔

امام حسینؑ نے فرمایا: "یَا اُخْتَاہُ کُلُّ الَّذِیْ قُضِیَ فَھُوَ کَائِنٌ۔ اے بہن مقدر کا لکھا مٹ نہیں سکتا۔

اس واقعے سے جنابِ زینبؑ کا ثباتِ قدم اور بھی مضبوط ہو جاتا ہے۔

شوہرِ زینبؑ اور امام حسینؑ

اُس کے بعد جب مقامِ تنعیم پر حسینی قافلہ ٹھہرا، تو اُس وقت عبداللہ بن جعفرؓ نے اپنے دونوں فرزند عونؑ و محمدؑ کو ایک خط کے ساتھ خدمتِ امام میں بھیجا جس کا مقصد یہ تھا۔ "برائے خدا اس کو دیکھتے ہی آپ

آگے کوچ نہ کیجیے گا میں آپ کا خیر خواہ ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ یہ سفر آپ کے لیے باعثِ ہلاکت ہو۔ اگر خدانخواستہ آپ کا وجود اسلام میں باقی نہ رہا تو گویا شمعِ توحید گل ہوگئی آپ کی ذات ہادیوں کی ہادی ہے اور ایمان والے آپ ہی سے فیض پاتے ہیں۔ اگر جانا ہی ہے تو ذرا جلدی نہ کیجیے گا۔ اس خط کے بعد میں بھی حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں۔

بہرحال عبداللہ حاضرِ خدمت ہوئے اور التوائے سفر کے لیے بہت کچھ الحاح وزاری کی۔ مگر حسینؑ نے فرمایا کہ میں اپنے نانا رسول اللہؐ کو خواب میں دیکھ چکا ہوں۔ انھیں کے حکم سے ایک مہتم بالشان کام کے لیے جا رہا ہوں۔ انھوں نے پوچھا: "آخر وہ کونسا کام ہے۔" ارشاد فرمایا: "یہ وہ راز ہے جس کو میں تا زیست افشا نہیں کروں گا۔ حتیٰ کہ دربارِ خداوندی میں پہنچ جاؤں گا۔"

عبداللہ بن جعفرؓ کو اب کوئی اصرار کی گنجائش باقی نہ رہی۔ اپنے فرزندوں کو پاس بلایا اور حکم دیا کہ نصرتِ حسینؑ میں اپنی جانوں کو عزیز نہ رکھنا۔ اور قدموں پر نثار ہو جانا۔ جنابِ زینبؑ شوہر کے اس طرزِ عمل سے بہت

خوش ہوئیں کہ خاندانِ عقیل سے بھی دو بچے راہِ خدا میں قربانی کے لیے شامل ہو گئے۔ اس مقام پر یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ عبداللہ بن جعفر نے حسینؑ کی بیعت کیوں نہ اختیار کی۔ اور فرزندِ رسولؐ سے اپنی جان کو عزیز رکھا؟

بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے۔ مگر نہیں! اتفاقِ علما ہے کہ اُن کو خود امام حسینؑ نے بیعت سے منع فرمایا اور حکم دیا کہ تم چونکہ اپنے جود و کرم کی وجہ سے محبوبِ خلائق ہو، لہٰذا تمہارا فرضِ اولین یہ ہے کہ میری عدم موجودگی میں بقیہ نفوسِ بنی ہاشم کی حفاظت کرو، یزید جن کا درپے آزار ہے۔ یہی نہیں بلکہ وہ چاہتا ہے کہ خاندانِ رسولؐ صفحۂ ہستی سے مٹ جائے۔

دوسری بین دلیل اُن کی موافقت میں یہ ہے کہ انسان فطرتاً اولادِ ذکور کو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا ہے۔ اور اپنی زندگی پر اُن کی حیات کو مرجح سمجھتا ہے۔ بھلا ہو سکتا ہے کہ عبداللہ اپنے دونوں صاحبزادوں کو تو حسینؑ کے ساتھ شہید ہونے کے لیے بھیج دیتے اور خود پہلو تہی کرتے۔

مشہور ہے کہ جب خبرِ شہادتِ امام حسینؑ عبد اللہ بن جعفرؓ کو پہنچی تو فرمایا:
اَلحَمدُ لِلّٰہِ عَزَّ عَلَیَّ مَصرَعُ الحُسَین۔ اِن لا اَکُن آسَیتُ حُسَیناً فَقَد آسَاہُ وَلَدَایَ۔ (شہادتِ حسینؑ مجھ پر سخت دشوار ہوئی۔ اگر میں نہ کر سکا تو میرے دونوں فرزند حقِ مواسات ادا کر گئے۔)

دوسری خبر یہ ہے کہ جب اُن سے کہا گیا کہ عونؑ و محمدؑ آپ کے فرزند بھی شہید ہو گئے تو ایک غلام خانہ زاد (ابو السلاسل) بھی سُن رہا تھا۔ رو کے کہنے لگا: "ھٰذا مالقینا من الحسینؑ" (حسینؑ کی اُلفت کا ہم کو یہ نتیجہ ملا) جنابِ عبد اللہؓ نے یہ سُن کے اُس کی سخت سرزنش کی۔

محمد بن حنفیہ

اسی طرح امام حسینؑ کے نفیہ بھائی محمد بن حنفیہؓ بھی شرکتِ شہادت سے محروم رہے۔ اوّل تو اُنھوں نے اپنے پدرِ بزرگوار کے زمانے میں ایک آہنی زرہ چیر ڈالی تھی، جس سے سیدھے ہاتھ کی اُنگلیاں بیکار ہو گئی تھیں۔ دوسرے علیل تھے۔ خلاصہ یہ کہ دونوں حضرات کے عذر

عقلِ سلیم کے نزدیک مقبول ہیں۔ اور سب سے زیادہ کھلی ہوئی بات تو یہ ہے کہ فردِ شہدا میں قدرت کی طرف سے اُن کا نام درج ہی نہیں ہوا تھا۔

امام حسینؓ اور بہن کی بزرگداشت

جہاں بھی آپ جنابِ زینبؓ کے حالات پڑھیے گا تو آپ کو یہ خصوصیت ملے گی کہ امام حسینؓ باوجودیکہ اُن سے عمر میں بڑے تھے مگر اُن کے برتاؤ سے معلوم ہوتا تھا کہ چھوٹے تھے اور کوئی کام بغیر اُن کی مرضی کے نہیں کرتے تھے۔ علیؑ مرتضیٰؓ نے جب سے کوفے کو اپنا دار الخلافہ بنایا تھا اُس وقت سے سُسرال کا رہنا تو جنابِ زینبؓ سے ترک ہی ہو گیا تھا۔ میکے ہی میں رہتی تھیں۔ اور گھر کی بزرگ بن گئے۔ باپ اس عقلمند بیٹی سے معاملاتِ خانہ داری میں اکثر مشورہ لیا کرتے تھے۔ آنجناب کی وفات کے بعد امام حسنؓ کے ساتھ کوفے سے پھر مدینے واپسی ہوئی، تو اسی گھر میں رہیں۔ اور حسینؓ سے ایسی محبت کرنے والی اور ساتھ دینے والی کہ کربلا سے کوفے اور شام تک ساتھ دیا۔ اللہ اللہ جیسا بھائی تھا ویسی ہی بہن ملی۔

معاملۂ جنگ اور زینبؑ

عام طور سے جنگی معاملات میں مردوں کے سوا عورتوں کا کوئی دخل نہیں ہوا کرتا۔ لیکن خاندان کے نوجوانوں کی جب باری آئی تو حسینؑ کے پاس اذنِ جہاد کے لیے حاضر ہوئے۔ اُن جناب نے جنابِ زینبؑ کی مرضی کو مقدم رکھا۔ قاسم بن حسنؑ، عباس بن علیؑ، علی اکبر بن حسینؑ ان سب کو جنابِ زینبؑ ہی نے اجازتِ جنگ دی۔ مصلحت اس میں یہ تھی کہ مرد کی تحریک سے کسی سپاہی کا جذبۂ شجاعت اتنا نہیں اُبھر سکتا جتنا عورت کی ترغیب سے (جنگِ اُحد کے حالات تو آپ نے سُنے ہی ہوں گے۔ لشکرِ اسلام سے نبرد آزمائی کے لیے نکلے تو زنانِ قریش کا ایک دستہ اُن کے عقب میں غیرت و جوش دلانے والا موجود تھا)

اس اجازتِ جنگ کے سلسلے میں جنابِ زینبؑ نے کسی نوجوان بنی ہاشم کے احساساتِ بیکسی و ناچاری کو برانگیختہ نہیں کیا بلکہ وقتِ اجازت وہی فقرات استعمال فرمائے جن کا مفہوم حسبِ دستورِ عرب (رجز) سے ملتا جلتا تھا۔ یعنی لڑنے والا اپنے مدِمقابل کے سامنے اپنا اندازِ

تفوّق۔ اسلاف کے دلیرانہ کارنامے اور خود اپنے گزشتہ جی داری کے واقعات بیان کر کے اُس کو مرغوب کرنا چاہتا تھا۔

حق تو یہ ہے کہ جس جنگ کا مطمحِ نظر نصرتِ حق ہو، خاندانی عزت کی حفاظت مدّنظر ہو، یا ذاتی تفوّق و شجاعت کا ثبوت مقصود ہو تو اُس وقت غم والم کے اظہار کا کیا موقع۔ خاندانِ بنی ہاشم کا بچہ بچہ عرب میں خونچکاں تلوار سے کھیلتا تھا۔ اُس کے نزدیک مرجانا کوئی بڑی بات نہ تھی۔ دلیروں پر اُس کی دلیری کے سکّے بیٹھے ہوئے تھے؛ اور آخر میں تو علی بن ابی طالبؑ نے اپنے دست و بازو سے شجاعتِ بنی ہاشم کی ایسی ساکھ بٹھا دی تھی کہ العظمۃ للّٰہ۔ عرب تو عرب مصر و روم کے تلوار یئے اُن کے چہرے کی فرضی تصویر اپنی تلواروں کے قبضوں پر کندہ کرا لیتے تھے، اور اُسے فتح کا مبارک شگون سمجھتے تھے۔

ہندوستان میں بھی مسلمانوں کے دورِ حکومت سے ابتک ہر قوم و ملّت کے پہلوان "بکیت"، "پھکیت"، "ظفر پئے" بنوٹیئے پہلے اُسی ساونت کا نام لے کے اکھاڑے میں

اُٹھ گئے ہیں اور اپنی طاقت وفن کا مظاہرہ شروع کرتے
ہیں۔
افسوس ہے کہ کربلا کے یادگار معرکے میں تقریباً چالیس
برس کی بیٹھائی ہوئی دھاک کا خاتمہ بڑی شان سے ہوگیا۔
اور ضرورت بھی اسی کی داعی تھی کہ شجاعت حیدری کو
آخری عظیم الشان قربانی دے کے رخصت کیا جائے حسینؑ
نے ویسا ہی کیا۔
میں نے اوپر بنی ہاشم کے نوجوانوں کا ذکر کیا ہے،
جس کے ماتحت پدر و فرزند کی یہ گفتگو معنی خیز ہے۔
یعنی امام حسینؑ نے کسی منزل پر ایک مہیب خواب دیکھا۔
(یہی ہوگا کہ جگر کے ٹکڑے راہِ خدا میں خون آلود
ہو رہے ہیں) علی اکبر سے ذکر کیا۔ اور نہ معلوم کیوں؟
نوجوان فرزند نے پوچھا: "بابا اَوَلَسْنَا عَلَی الْحَقِّ کیا ہم حق پر
نہیں ہیں؟ فرمایا: "بےشک تم حق پر ہو"۔ وہ استقلال کا
مجسمہ جواب دیتا ہے اِذًا لَا نُبَالِی بِالْمَوْتِ (اب ہمیں
موت کا کوئی ڈر نہیں) کسی دوسرے موقعے پر قاسم بن
حسنؑ نے بھی فرمایا ہے "اَلْمَوْتُ اَحْلٰی مِنَ الْعَسَلِ"

(موت شہد سے زیادہ شیریں ہے)

شجاعانِ اقوام کا یہی معمول رہا ہے اور رہے گا کہ حفظِ ناموس و شرف، یا حمایتِ شریعت و ملت کے لیے موت کو فخر سمجھتے ہیں۔ ٹیپو سلطان کا یہ تاریخی واقعہ تو آپ کو معلوم ہی ہو گا کہ جب انگریزوں کی فوج نے ۱۷۹۹ء میں سرنگاپٹم کے قلعے کو گھیر لیا تو اُس کے مشیروں نے کہا: "اب مقابلہ دشوار ہے"۔ وہ شیر دل گرج کے بولا: "سو برس کتّے کی طرح زندہ رہنے سے ایک دن کی شیرانہ زندگی لاکھ درجے بہتر ہے"۔ چنانچہ معرکۂ قتال کے بعد اُس غیور سپاہی کی لاش مقتولین کی صفِ اوّل میں پائی گئی۔

یہ تو مردانہ شجاعت کا ذکر تھا۔ لیکن اپنے موضوعِ تالیف کے سلسلے میں مجھے صنفِ نازک کی جگر داری کی بھی چند مثالیں پیش کرنی ہیں۔ کیونکہ مجھے ناظرین کے ساتھ ناظرات کو بھی خوش کرنا ہے۔

عورت کی شجاعت

شجاعت یہی نہیں ہے کہ ذرا سی بات میں تیور بگڑ گئے۔

شیا تپ چلنے لگی، لہولہان ہو گئے۔ جیسے زمانۂ جاہلیت میں قبائلِ عرب کی جنگ۔ خیر۔ مَردوں کے لیے کچھ کہہ لیجیے۔ فلاں تلوار کا دھنی ہے، فلاں بڑا اکڑوا ہے۔ لیکن قدرت نے کیا عورت کے حصّے میں شجاعت نہیں عنایت فرمائی ہے۔ نہیں۔ ضرور مرحمت کی ہے۔ لیکن اپنے صحیح معنوں میں۔ یعنی استقلال کے ساتھ اپنی عصمت کا دِفاع۔

دُنیا کی جنگ نواز عورتیں

اگرچہ تاریخِ اسلام بلکہ دوسری اقوام کی تاریخوں سے بھی نشان ملتا ہے کہ عورتیں مردوں کی طرح پانچوں ہتیار، دِل سے لیس ہو کے دُشمن کے مقابلے میں مردوں کی طرح نبردآزما ہوئی ہیں۔ جیسے عرب میں۔

اُمِ سلیم۔ انس بن مالک کی والدہ۔ جنابِ انس کی جب دس سال کی عمر ہوگئی، تو ابو طلحہ سے عقدِ ثانی کرلیا۔ اور اُن کے ہمراہ جنگِ اُحد، وحنین میں شریک تھیں۔

اُمِ عمارہ (بنت کعب) جنگِ اُحد میں نہایت جرأت و دلاوری دکھائی (قاموس المشاہیر)

جون آف آرک (فرانسیسی دختر) جب انگریزوں نے ۱۴۲۹ء میں فرانسیسیوں کو شکست دے کے شہر آرلینس پر قبضہ کر لیا، تو یہ جنگل میں گلہ بانی کر رہی تھی۔ محبت وطن نے جوش مارا۔ اور شہر میں آکے فرانسیسی شکست خوردہ فوج میں اپنے آتشیں فقروں سے شجاعت کی بجھی ہوئی آگ بھڑکا دی۔ رن پڑا اور انگریزوں کو نکال دیا۔ ۱۴۳۱ء میں پھر انگریزوں نے حملہ کیا۔ اس مرتبہ جون زخمی ہو کے قید فرنگ میں آئی۔ اور ایک ساحرہ قرار دے کے زندہ جلا دی گئی۔

لکشمی بائی (جھانسی کی رانی) غدر ۱۸۵۷ء میں انگریزوں سے لڑی۔ پڑوس کے راجاؤں نے چونکہ اُس کی مدد نہیں کی، لہذا قلعے پر انگریز قابض ہو گئے، اور قریب تھا کہ گرفتار ہو جاتے۔ عرب گھوڑا ران کے نیچے تھا، فصیل قلعہ سے ایڑ دی تو وہ برق رفتار تڑپ کے نیچے آیا۔ رانی نے افغانوں کی ٹکڑی کے ساتھ گوالیار کی طرف باگ موڑ دی۔ اور جاتے ہی اچانک شہر پر یلغار کر کے اُسے فتح کر لیا۔ راجہ فرار ہو گیا۔ اور یہ رانی قابض ہو گئی۔ اُس نے خزانے کے

دروازے کھول دیے، اور حکم دیدیا کہ جس کا جی چاہے لوٹ لے۔ اور کیا؟

یہ سُن کے جھانسی کی انگریزی فوج گوالیار پہنچی۔ رانی تھوڑے سے مقابلے کے بعد کمزور پڑی۔ یہاں تک کہ ران میں گولی لگ گئی۔ اُسی عالم میں چند مددگاروں کے ساتھ کالپی کی طرف بھاگی۔ انگریزی فوج نے تعاقب کیا جب دُشمن بہت قریب آگئے، اور قریب تھا کہ گرفتار ہو جائے، تو گھوڑے سے اُتر پڑی، اور ایک گھاس کی گنجی میں جو جنگل میں کسی کسان کی جمع کی ہوئی تھی، بیٹھ گئی اور اپنی ایک سہیلی کو حکم دیا، کہ آگ لگا دے۔ اُس نے تعمیل حکم کی۔ اور اس طرح وہ بہادر عورت ننگِ قید سے آزاد ہو کے نذرِ آتش ہو گئی۔

چاند بی بی یا چاند سلطانہ (حسین نظام شاہ والیٔ احمد نگر کی دختر) علی عادل شاہ والیٔ بیجاپور کی بیگم۔ ۱۵۸۰ء میں بعد وفات شوہر ابراہیم عادل اُس کا بھتیجا مستحقِ سلطنت قرار پایا۔ چاند بی بی اُس کی طرف سے مہماتِ سلطنت کی دیکھ بھال کرتی تھی اور دادِ سیاست

دی تھی۔ سنہ ۱۵۹۵ء میں، جب شاہزادہ مراد نے دکن پر
لشکر کشی کی تھی تو اُس نے احمد نگر کو مغلوں کی دستبرد سے
بچایا تھا۔ اس جنگ میں ہوشیاری، مردانہ وار ہمت
اور استقلال جو چاند نے دکھایا وہ تاریخ میں یادگار
ہے۔ میدانِ جنگ میں بے دھڑک آکے خود سلطانہ نے
فوج کی کمان کی۔ مراد اس قدر عاجز ہوا کہ صلح کرنی پڑی۔
سنہ ۱۵۹۹ء میں دوبارہ اکبر کی فوج نے احمد نگر پر یورش کی
حبشہ خاں خواجہ سرا نے بعض اہلِ قلعہ سے سازش کر کے
چاند سلطانہ کو مار ڈالا۔ اور یوں قلعہ فتح ہوا۔
دُرگاوتی۔ راجہ مہوبا کی بیٹی، حُسن و جمال، شجاعت
و سخاوت میں یکتائے دہر تھی۔ اکبر کا زمانہ تھا سارا
ہندوستان فتح ہو چکا تھا۔ اُس نے (آصف خاں) گورنر
الہ آباد کو گڑھ منڈل فتح کرنے پر مامور کیا۔ وہ چھ ہزار
سوار اور بارہ ہزار پیدل لے کے یلغار کے لیے روانہ ہوا
گڑھی کے سامنے رانی کے لشکر سے تصادم ہوا۔ ایسا شدید
رن پڑا کہ فوج اکبری کے دانت کھٹے ہو گئے۔ میاں
آصف خاں سلیمانی تسبیح کھٹکھٹانے لگے کہ ناکامی ہی

لاج رکھنا۔ سوءِ اتفاق سے رانی کی آنکھ میں ایک تیر پیوست ہوگیا۔ نوجوان فرزند بھی کام آیا۔ اب اُس کی فوج کے قدم اُکھڑنے لگے، عالمِ یاس میں اپنے مہابت کی کمر سے خنجر نکال کے اپنے پہلو میں پیوست کرلیا۔ آصف خاں کو خبر ملی تو اُس نے گڑھ منڈل کا محاصرہ کرلیا۔ قبل اس کے کہ وہ اندر داخل ہو، رانی کی بہادری سے متاثر ہو کے قلعہ کی تمام عورتیں جلتی ہوئی آگ میں کود پڑیں۔

اسی شجاعتِ صنفِ لطیف کے سلسلے میں یہ تاریخی اطلاع بھی پُر لطف ثابت ہوگی کہ:

آمیزونس۔ لاطینی زبان میں جس کے معنے (سینہ سپاٹ) ہیں۔ ہزاروں سال پہلے یہ بہادر عورتوں کا گروہ کوہ قاف سے اُتر کے افریقہ میں آباد ہوگیا تھا۔ اور اپنے ہی گروہ کی ایک رانی کا فرماں بردار اور اُس کے حکم پر سر فروشی کرنے کو تیار رہتا تھا۔ اس گروہ کی لڑکی جب اُبھار کی عمر پہ پہنچتی تھی تو جانبِ راست کا پُر گوشت سینے کا حصہ قطع کرا دیتی تھی۔ تاکہ تیراندازی یا تیغ زنی کے وقت سیدھے ہاتھ کی جنگی حرکت میں رُکاوٹ نہ پیدا کرے۔ دلچسپ واقعہ یہ ہے کہ بقائے نسل کے معاملے میں

وہ مردوں سے گریز نہیں کرتی تھیں، ہاں اُن کو اپنی بستی میں قیام نہیں کرنے دیتی تھیں۔ وضع حمل کے بعد اگر لڑکی پیدا ہوتی تھی تو خود پرورش کرتی تھیں، اور اگر اتفاق سے لڑکا پیدا ہوگیا تو ایامِ رضاعت کے بعد فوراً باپ کے حوالے کر دیا جاتا تھا تاکہ پرورش کرے۔ دَورِ قدیم کی تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ ان مردانہ روش عورتوں نے میدانِ جنگ میں کئی بادشاہوں کا ساتھ دیا اور اُن کے مخالفین سے نبرد آزمائی کر کے شکست فاش دی۔

سادات بارہ کا ذکر

جیسے ہمارے ہندوستان میں بارھہ کے سید حسن علی خاں اور حسین علی خاں تھے، جو تاریخ ہند میں (سید برادرس) کے نام سے مشہور ہیں۔ یہ بادشاہ گر کہلاتے تھے۔ جس کی طرف سے لڑتے اُس کا پلہ بھاری ہو جاتا۔ چنانچہ شاہ عالمگیر کے بعد جب محمد معظم (بہادر شاہ) اور اعظم شاہ دونوں بھائیوں میں دھولپور کے پاس جنگ ہوئی تو سیدانِ مذکور معظم کے طرفدار تھے، جس کو شکست ہی ہونے والی تھی کہ اُنھوں نے اپنے ہمراہیوں کے ساتھ دادِ شجاعت دی اور جنگ کا پانسہ پلٹ دیا۔

لیکن عورت کی شجاعت صرف ایسی مردانہ جنگ پر۔

منحصر نہیں اُس کی شجاعت کے مظاہروں کے لیے تو ہے مدد لینے کی ضرورت نہیں۔ استقلال کے ساتھ حق پر ضد کر جائے تو اُس کی آواز تلوار بن جاتی ہے، اُس کے تیکھے تیور بھالے کا کام دینے لگتے ہیں، اُس کا معنی خیز مخالف کو گھورکے دیکھنا دل کو برما دیتا ہے اور بے بسی کے عالم میں تو اُس کی گلابی آنکھوں کا ایک آنسو لاکھوں جیوٹ سپاہیوں کے جوش پراگندہ کر دینے کو کافی ہے۔

مشہور واقعہ ہے کہ سکندر جب دارا (شاہِ ایران) کے مقابلے میں مقدونیہ سے یلغار کر کے (۳۳۲ سال قبلِ مسیح) عجم پہنچا، تو مقدونیہ میں اپنے ایک جنرل اینٹی پیٹر نامی کو اپنا قائم مقام کر کے انتظامِ سلطنت کیلئے چھوڑ گیا تھا۔ اتفاق سے سکندر کی ماں اولمپیا سے اور اُس سے نہیں بنی۔ بمبرادرِ مذکور نے سکندر کے پاس ایک شکایت آمیز خط بھیجا۔ اگرچہ وہ شکایت سیاسی نقطۂ نظر سے بجا و درست تھی۔ اُس پر بھی اس نے جواب دیا: "اے اینٹی پیٹر یاد رکھ! میری ماں کی آنکھ سے آنسو کا ایک قطرہ تیری ایسی ہزار شکایات کے دفتروں کو ایک دم میں سادہ ورق کر دے گا۔"

اطمینانِ قلب کا دوسرا نام شجاعت ہے۔ دوسرے الفاظ میں۔ انسان پر جو مصیبت نازل ہو، ہوش و حواس بجا رکھتے ہوئے اُس کا پورا پورا مقابلہ کرے۔ اگر اُس کے دفعیہ میں کامیاب ہوا تو بے شک شجاع کہلائے جانے کا مستحق ہے، اگر نہ بھی ہوا تب بھی بے شک وہ شجاع ہے، کیونکہ اُس نے اپنی سی کرلی:

شکست و فتح تو قسمت کے ہاتھ ہے اے میرؔ
مقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا

اسلام میں شجاعت کے حقیقی مجسّمے دو ہی گزرے ہیں یا تو محمدؐ ابنِ عبداللہ، یا پھر علیؑ ابن ابی طالب۔ عرب کی حقیقی شجاعت کا سہرا انھیں دونوں کے سر رہا۔ ایک تو خدا کا آخری رسول، اور دوسرا راہِ ہدایت کا پہلا امام۔

اگرچہ تاریخ اسلام میں شجاعوں کی کمی نہیں، جیسے طلحہ، زبیر، خالد وغیرہم۔ لیکن یہاں اُن کا ذکر مقصود نہیں۔

میں اس وقت صنفِ لطیف کی مدح سرائی میں اعتقادیات سے بحث نہیں کر رہا ہوں بلکہ تاریخی اور تمدنی نقطۂ نظر سے دیا بحکم قرآنی اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَاءِ (مرد عورتوں سے بڑھ چڑھ کے ہیں) بلسیرِ و چشم منظور ہے پا:

لما بلغ النبی ان فارس ملکوا ابنۃ کسریٰ قال لن یفلح قومٌ ولّوا امرھم امرأۃً (بخاری باب الفتن) (جس وقت آنحضرت کو خبر پہنچی کہ اہلِ فارس نے دخترِ کسریٰ کو تاجِ شاہی پہنا دیا تو فرمایا: "وہ قوم پھول پھل نہیں سکتی جس کی حاکمہ عورت ہو) لیکن یہ بات دیکھنے کی ہے کہ جہاں تک سیاسی عظمت و جلالت کا تعلق ہے ابتدائے عالم سے لیکے اس وقت تک صنفِ ذکور نے اناث کو اُبھرنے کا موقع نہیں دیا۔ اور اگر کسی نے جرأت کی بھی تو اُس کے سامنے ایک خونیں پردہ ڈالدیا گیا۔ جس کی شکنوں میں وہ خود اُلجھ کے رہ گئی! اور یہ مخالف جذبہ کبھی رشک اور کبھی حسد کی صورت میں اُن بیچاریوں کے لیے باعثِ ہلاکت ثابت ہوتا رہا اور غالباً ہوتا رہے گا۔

(جہاں جہاں عورت نے حکومت کی وہ دوسرے معنوں میں مردوں ہی کی تھی۔) مرد محبت سے عورتوں کی حکمرانی برداشت کر سکتا ہے۔ لیکن طاقت و رعب سے کبھی نہیں۔ قانونِ فطرت!

شجاعت کے لیے ایثار و قربانی لازمی ہے

شجاع جہاں اپنا سر ہتیلی پر لیے ہوتا ہے۔ اُس کے ساتھ ہی وہ اپنے دوسرے صفاتِ کمالیہ سے بے حس نہیں رہتا۔ کیونکہ جذبۂ شجاعت اپنی برتری کے مقابلے میں ہر دوسری

طاقت کو اپنا ماتحت دیکھنا چاہتا ہے، لہذا اظہارِ شجاعت کے
وقت شجاع کی نظر میں فرزند مٹی کا ڈھیر اور جواہرات ٹھیکریاں ہو جاتے ہیں۔
مرد میں اگر شجاعت کے ساتھ جذبۂ ایثار و قربانی پایا جاتا ہے تو کچھ
زیادہ قابلِ تعریف بات نہیں، اُن کی توجیہت بھی بٹ ہے۔ لیکن
عورت ذات میں یہ نایاب صفت پائی جائے تو بے شک قابلِ ہزار مدح ہے۔
مشہور بات ہے کہ جب جنابِ ابراہیمؑ حکمِ خواب کے مطابق
جنابِ اسمٰعیلؑ اپنے فرزند کو قربانی کے لیے لے چلے تو بی بی ہاجرہؑ
سے فرمایا کہ فرزند کو بنا سنوار دو میں اسے ایک دوست کی
دعوت میں لیے جا رہا ہوں۔ حاصلِ کلام یہ کہ اللہ کے دوست
حضرتِ ابراہیمؑ، حکمِ احکم الحاکمین نظر میں اور جذبۂ قربانی دل میں
لیے ہوئے قربان گاہ پہنچتے ہیں۔ فرزند سے اپنا الہامی خواب
اور حکمِ خداوندی بیان فرماتے ہیں۔ وہ فرماں بردار گردنِ
اطاعت خم کر دیتا ہے اور یہ بہادر باپ ہاتھ میں خنجر لے لیتا
ہے۔ لیکن اسمٰعیلؑ عرض کرتے ہیں: "بابا آنکھوں میں پٹی باندھ لیجیے،
تاکہ محبتِ پدری تکمیلِ مقصد میں حائج نہو۔" باپ منظور
کر لیتا ہے۔ اس مقام پر قیاس تو یہ چاہتا ہے کہ جنابِ براہیمؑ کو
خواہشِ فرزند رد کر دینی چاہیے تھی۔ تاکہ حکمِ خدا کی بے لوث متابعت

کا ظاہر ہو جاتا۔ مگر مصلحتِ خداوندی جو ہونا تھا سو ہوا۔
لیکن جب اسمٰعیل صحیح و سلامت گھر واپس آئے تو ہاجرہ
نے دیکھا کہ گلے کی نازک کھال پر ایک سُرخی مائل خط پڑا ہوا
ہے۔ ماں کا کلیجہ تھا۔ نہ معلوم کیا خیال گزرا، غش کھا کے
گر پڑیں۔ خیر۔
لیکن جنابِ زینبؑ کے متعلق راویوں نے لکھا ہے کہ
عونؑ و محمدؑ کے جسم پر خود سلاحِ جنگ آراستہ کرتی جاتی
تھیں اور ہنس ہنس کے اُن کے جدِّ بزرگوار جعفرِ طیارؑ اور
نانا حیدرِ کرارؑ کے جنگی کارناموں کو دوہراتی جاتی تھیں۔
اگر یہی ہے تو اللہ جانے کیسی شجاع خاتون تھیں کہ سُننے والوں
کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اب رہا جذبۂ قربانی کا سوال
تو ایک فرزند قربان نہیں کیا بلکہ دو دو۔

بقر عید کی قربانی

غالباً علاوہ دوسرے مصالح اعتقادی کے مسئلہ قربانی
میں بانیٔ اسلام کا یہ مطمح نظر بھی تھا کہ راہِ خدا میں جہاد کرنیوالوں کی
نگاہیں خونیں مناظر کی عادی رہیں اور مجاہدانہ جذبے کا
سالانہ اعادہ ہوتا رہے۔ ایسا ہو کہ اگر ایک بیٹیر سامنے ذبح

کردی جائے تو مسلمان صاحب کو دیکھ کے غش آجائے۔
غرض یہ ہے کہ سلسلۂ بنی ہاشم کی ایک خاتون (زینبؑ) نے اپنے اجداد کی شجاعانہ روایات کو کیسے کیسے صبر آزما موقعوں پر قائم رکھا۔ اگر اسلام میں عورتوں سے جہاد ساقط نہوتا تو فصاحتِ حیدری سے پہلے ذوالفقارِ حیدری زینبؑ کے ہاتھ سے استعمال ہوچکی ہوتی۔

اوّل عصرِ عاشورا جب یزیدی فوج حسینی کیمپ میں داخل ہوئی تو مال و اسباب جو لوٹا سو لوٹا۔ مگر بعض سخت دل کافروں نے حسینؑ کے بیمار فرزند (سیدِ سجاد) کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تو جنابِ زینبؑ ہی کی شجاعانہ للکار نے اُن ظالموں کو اس بزدلانہ ارادے سے باز رکھا۔

دوم جس وقت ابنِ زیاد (حاکمِ کوفہ) کے سامنے اسیرانِ کربلا پیش کیے گئے تو اُس نے حسینؑ کے فرزند سیدِ سجاد سے کچھ ایسے نالائم فقرے کہے کہ ان کو تابِ صبر نہ رہی اور منھ توڑ جواب دیدیا۔ ابنِ زیاد اُس وقت نشۂ فتح میں بدمست تھا۔ بھلا کاہے کو سننے لگا تھا۔ حکم دیدیا "قتل کردو"۔ سوچیے! یہ وقت آلِ رسولؐ پر کیسا قیامت خیز ہوگا۔

اسیروں کا قافلہ سالار، نسلِ فاطمہ کا آخری فرزند قتل کیا جانیوالا ہے۔ تیغِ جلّاد اٹھ چکی ہے۔ سجاد کا سر خم ہے۔ کہ دفعتہً زینبؑ کے حیدری خون میں جوش پیدا ہوتا ہے۔ بڑھ کے اپنے ہاتھ گردنِ سجاد میں ڈال دیتی ہیں۔ اور بآوازِ بلند کہتی ہیں:

"جب تک میری جان میں جان ہے یہ فرزند قتل نہیں ہوسکتا"

لاکھ لاکھ گردن سے ہاتھ چھڑانے جانے کی کوشش کیجاتی ہے مگر بے سود۔ حتیٰ کہ ارادۂ قتلِ سجاد ملتوی کر دیا جاتا ہے۔ اسی طرح کا واقعہ دربارِ یزید میں بھی پیش آیا۔ اور یہاں بھی زینبؑ ہی کی دیرانہ آوا نے حسینؑ کے لال کو قتل سے بچایا۔

اردو مرثیہ اور جنابِ زینبؑ

اردو مرثیے نے جس لباس میں جنابِ زینبؑ کو پیش کیا ہے اُس کے تار و پود اول تو کمزور روایات ہیں۔ دوسرے انکی ذات کو ایک اعلیٰ سے اعلیٰ خاندان کی خاتون فرض کرلیا ہے جس میں ہندوستانی عورتوں کی معاشرت کے نقطۂ نظر سے تمام اقوال و افعال، حرکات و سکنات دکھائے گئے ہیں۔ حتیٰ کہ عزیزانہ تعلقات کے انداز، رسم و رواج کی پابندیاں، جنکے بغیر اردو مرثیہ صرف الفاظ کا ایک ڈھانچہ رہ جاتا ہے! اول سے

آخر تک سب ہندوستانی رنگ میں رنگی ہوئی ہیں بڑے بڑے
مرثیہ گویوں کے لیے سوائے اس کے کوئی چارہ بھی نہ تھا کہ ہندی
ماحول سے انھیں چیزوں کو انتخاب کرتے جو سننے والوں کے لیے
قابل قبول ہو سکتی تھیں۔

اس روشِ انتخاب میں جو شاعر جتنا کامیاب ہوا ہے اُتنا
ہی اعلیٰ درجے کا مرثیہ گو کہلائے جانے کا مستحق ہے۔ ورنہ اگر
کوئی شاعر ہندوستانی سامعین کے سامنے عرب و عجم کی صحیح
معاشرت کے مناظر الفاظ کے ذریعے سے پیش کرے تو لازمی
امر ہے کہ یا تو لوگ بددلی سے سنیں گے۔ یا پھر مجلس میں مضامین
کی تہ میں بستر خواب کا لطف آنے لگے گا۔

انیسؔ مغفور کی کامیابی کا گُر۔ سوائے اس کے اور کچھ نہ تھا
کہ وہ لکھنؤ کے نوابانہ خاندانوں کی صحبتوں میں بیٹھے اُٹھتے تھے۔
فیض آباد اور لکھنؤ میں سالار جنگ مرحوم کا خاندان سلاست
زبان کے لیے مشہور تھا۔ انیس مرحوم اُن کی ستھری صحبتوں میں
شریک ہوتے تھے۔ یا نواب عاشور علی خاں کی محفل۔ جان صاحب
(شاعر لسانیات) جس کی پیداوار ہیں۔ ٹھیک ویسے ہی جیسے
دہلی میں فتح الملک مرزا فخرو کا شعرا نواز دربار تھا۔

انیسؔ ان ہی صحبتوں میں شامل رہتے تھے۔ اُن کی صاف
ستھری زبان ذہن نشین کرتے تھے' اور اُن کے امیرانہ حرکات و
سکنات پر نظر رکھتے تھے۔ اب یہ اُن کا قدرتی ملکہ تھا کہ مشاہدات
کا صرف اس خوبصورتی سے کر دیتے تھے کہ نظم میں چار چاند
لگ جاتے تھے۔ جس طرح کہ قلعۂ معلیٰ کے شاہی ماحول نے داغؔ مرحوم
کی زبان کو جمنا کی نفیس لہروں سے زیادہ صاف شفاف کر دیا
تھا۔ اسی طرح انیسؔ کی زبان پر۔ گو وہ دہلی ہی کی کیوں نہ فرض
کر لی جائے۔ ان صحبتوں سے جلا ہو گئی تھی۔ درست خیال ہے
کہ اگر وہ دہلی میں رہ کے مرثیہ کہتے' تو لکھنؤ کی زبان اور
شیعی ماحول کا فقدان اُن کو ہرگز اتنا کامیاب مرثیہ گو نہ بنا سکتا۔
جس کا اُن کو خود اعتراف تھا۔ یعنی حیدرآباد کے منبر پر نکتہ سنجوں
کی کمی محسوس کرتے ہوئے پکار اُٹھے: "ہائے لکھنؤ تجھے کہاں سے لاؤں"۔

برخلاف اس کے اگرچہ شاعر بزرگانِ دہلی کی ستھری محفلوں نے
جنابِ داغؔ میں ظاہری نفاست نظم کی خوبی پیدا کر دی تھی۔
لیکن اسی کے ساتھ اُن کے اثرات کا دوسرا رُخ تہذیبِ شعر کے
حق میں زہرِ قاتل بن گیا۔ قلعۂ معلیٰ میں شب بھر شاہی شوقین مزاجیاں
رنگیلی نوا زیاں آخر کو رنگ لائیں اور جنابِ داغؔ کھل کھیلے غنیمت

یہ ہوا کہ ذوقؔ، غالبؔ، مومنؔ ایسے پختہ کار بڈھے زندہ تھے جنھوں نے اپنے سنجیدہ اثراتِ شعر سے کام لیا اور خواص کے رنگِ سخن کو بگڑنے نہیں دیا۔

میری یہ غرض نہیں کہ انیسؔ کو ایسی صحبتوں سے سابقہ نہیں پڑا۔ شاہزادے اور نواب زادے ہر جگہ عیش و عشرت کے متوالے ہوتے ہیں، لیکن اُس شاعر کی قوتِ آخذہ اس قدر صحیح تھی کہ ہر چیز کا جوہر لے لیا اور سفل چھوڑ دیا۔ دوسرے اگر انیسؔ غزل گو ہوتے تو احتمال تھا کہ ویسے ہی ہو جاتے جیسے داغؔ۔ مگر جو صنفِ سخن (مرثیہ) اُنھوں نے اختیار کی تھی اُس میں ایسے رنگین اور شوخ مضامین جو عامیانہ جھلک دیتے ہیں کھپ نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا مجبوراً اعلیٰ اخلاقِ تمدن کا روشن پہلو اختیار کرنا پڑا۔ اب اسے چاہے آپ اختیارِ صنفِ شعر میں انیسؔ کا اندازہ صحیح کہیے، چاہے مرثیے کا اعجاز۔

بہرحال یہ تالیف جنابِ زینبؑ کی ذات گوشش کر رہی ہے۔ اُس کے خط و خال ہاشمی و مطلبی ہیں۔ اُس کے حرکات و سکنات، جذبات و معمولات وہی ہیں جو عرب کے اس ممتاز

قبیلے کی خواتین میں بانٹے جا سکتے ہیں۔

اس آخری نقطۂ نظر سے تو میں آگے بحث کروں گا۔ اس وقت ناظرین کی دلچسپی کیلیے اُردو مرثیے کے چوکھٹے میں جناب زینبؑ کا مرقع پیش کرتا ہوں۔

اُردو مرثیہ اور جنابِ زینبؑ کا کردارِ بلند

اوپر ذکر ہو چکا ہے کہ اس جلیل القدر خاتونِ اہلبیت کی ذہانت و ذکاوت، معاملہ فہمی، و موقع شناسی سے خاندان کے تمام افراد متاثر تھے۔ اور اُن سے اکثر مشورہ طلب ہوتے تھے۔ چنانچہ قافلۂ حسینی جب کربلا میں داخل ہوا تو جناب عباس نے بڑھ کے امام حسینؑ سے خیمہ نصب کرنے کے مقام کے متعلق استفسار کیا۔ آنجناب نے بھائی سے کہا کہ زینبؑ جہاں کہیں وہیں خیمہ بپا کرو۔ حالانکہ جنگی نقطۂ نظر سے حسینؑ کو حق تھا کہ وہ خود تجویز مقام کرتے۔

امام حسینؑ کے گھر میں اس بی بی کی عجیب ہستی تھی اور شیرِ خدا کی بیٹی رزم و بزم دونوں کی رونق۔ حسنینؑ اور دوسری اولادِ علیؑ کے لڑکے لڑکیوں کی شادی بیاہ چھٹی چلّے تو انھیں کے مشورے سے ہوتے ہی رہتے تھے۔ لیکن کربلا کے خونیں معرکے میں بھی اس خاتون نے

حیرت انگیز حصہ لیا ہے جب کسی کی جان پر آجاتی ہے تو پھر نہ کسی کی محبت دل میں باقی رہتی ہے نہ کسی بزرگ کی بزرگی لیکن جنابِ زینبؑ حیات و مماتِ آلِ رسولؐ کا ایک مستقل مرکز معلوم ہوتی ہیں۔
حسینؑ موجود تھے اعزا کو سرفروشی کے لیے اُن کی اجازت کافی تھی۔ مگر جو بھی اُن جناب کے پاس گیا اُنھوں نے اطمینان کے ساتھ پہلے جنابِ زینبؑ کی مرضی کی طرف اشارہ کر دیا جب اُن کی "ہاں" ہو گئی تو اُن جناب نے بھی فرما دیا۔ "بسم اللہ"

نند بھاوج کے تعلقات

روزِ عاشورا جب حسینؑ کے فرزند علی اکبر نے اجازتِ جنگ چاہی تو اُنھوں نے حسبِ معمول فرما دیا کہ پہلے اپنی محترمہ پھوپی سے اجازت لے لو جنھوں نے تم کو فرزند کی طرح پالا ہے۔ یہ خیمے میں آتے ہیں اور ماں، پھوپی، بہنوں اور دوسری محترمات کو ایک جگہ بیٹھے دیکھتے ہیں اور سیدھے آکے جنابِ زینبؑ کے سامنے گھٹنے ٹیک کے دست بستہ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ زینبؑ تو سمجھ گئیں لیکن انجان بن کے پوچھا: "بیٹا علی اکبر کیا ہے" اُنھوں نے عرض کی: "اجازتِ جنگ مرحمت ہو"۔
یہ موقع جنابِ زینبؑ کے لیے نہایت نازک تھا۔ ماں کے ہوتے

کوئی بیٹا پھوپی سے مرنے کی رضا چاہے تو اُس دکھیاری کے سینے پر سانپ نہ لوٹ جائیگا؟ ذرا غور کیجیے۔ ایک ماں جس نے اپنے سینے سے سفید خون چُسا چُسا کے بیٹے کو پروان چڑھایا ہو اُس کی زندگی و موت کا اختیار اُس کے ہاتھ سے نکل کے دوسرے کے ہاتھ میں چلا جائے (عورت کا دل پتھر کا نہیں ہوا کرتا۔ آبگینہ ہوتا ہے) جنابِ بانو کلیجہ تھام کے رہ گئی ہونگی مگر اُن کے مقابلے میں جنابِ زینبؑ کوئی معمولی عورت نہیں تھیں جن کو اس نازک معاملے میں بھاوج کے لطیف احساسات کا خیال نہ ہوتا۔ کس خوبصورتی سے دفعِ دخل کیا ہے' اور کس لطافت سے مرثیے نے تصویر کھینچی ہے۔

اس سنجیدہ بی بی نے بانو کی طرف اشارہ کرکے کہا: "بیٹا علی اکبرؑ اس اجازتِ جنگ کے معاملے میں تمھاری ماں کا زیادہ حق ہے۔ جس نے تمھیں پال پوس کے اتنا بڑا کیا ہے۔ خود گیلے میں سوئی اور تمھیں سوکھے میں سُلایا۔ تمھارے آرام کی خاطر راتوں کی نیند حرام کرلی۔ میں دیکھنے والی موجود ہوں ؎

برسوں یہ بی بی ایک ہی کروٹ سے سوئی ہے

زینبؑ کے اس طرزِ عمل سے جنابِ بانو کے جسم میں جلیوؤں

خون بڑھ گیا ہوگا۔ چہرے پر فخر کی سرخی پیدا ہو گئی ہوگی، اور
آنکھوں میں محبتِ فرزند کی روشنی اور تیز ہو گئی ہوگی۔

ادھر عالمِ محویت میں علی اکبر کا رُخ اب ماں کی طرف ہو گیا۔
ایک لمحے کے لیے چہرے پر نظر کی اور پھر کچھ سوچ کے نگاہیں نیچی
کر لیں ــ انسانی فطرت ہے کہ اگر اُس کے حقوق کا صحیح اعتراف
کر لیا جائے تو وہ اُن سے دست بردار ہو جانے میں اپنے آپ کو
زیادہ مفتخر سمجھتا ہے اور انکسارانہ ادا سے اظہارِ استغنا کرنے لگتا ہے۔ لیلا

بانو نے ہاتھ جوڑ کے زینب سے یہ کہا — صدقے گئی کنیز کی خدمت کا ذکر کیا
اس قافلے میں آپ ہیں اب فاطمہؑ کی جا — میں نے بھی دی جو آپ نے بیٹے تو دی رضا
صدقے ہے یہ بھی عورت پروانہ آپ پر — پر کیا کرے کہ آج مصیبت ہے باپ پر

ماں اور پھوپی دونوں کی رضا حاصل ہو جاتی ہے تو علی اکبر باپ
کے پاس آ کے خوش خبری سُناتے ہیں۔

زمانے کا وہ لمحہ حسینؑ کے صبر کا شاہد ہے گا کہ نہ تو ابرو پر شکن
پڑی، نہ روشِ کلام میں فرق آیا جیسے کچھ ہوا ہی نہیں (یہ بھی
ملحوظ رہے کہ چند منٹ پہلے برابر کے بھائی عباس کی لاش
کے ٹکڑے کانپتے ہاتھوں سے اُٹھا کے لا چکے تھے) علی اکبر کو
ساتھ لے کے خیمے میں آئے یہ مقصد یہ تھا کہ اپنے صابرانہ طرزِ عمل سے

اہل حرم کا غم غلط کریں۔ چنانچہ بقول انیس

بانو کے منھ کو دیکھ کے حضرت نے یہ کہا کیوں سچ ہے تم نے بیٹے کو مرنے کی دی رضا
وہ چپ ہوئیں تو بولے بہن سے شہ ہدا کہیے پھوپی بھتیجوں میں کیا فیصلہ ہوا
راہیں سب انکے روکنے کی بند ہو گئیں
سنتا ہوں میں کہ تم بھی رضا مند ہو گئیں

اس روش سے عزیزانہ تعلقات کا اظہار اور بے تکلف گفتگو تو بے فکری کے لمحوں میں ہوا کرتی ہے۔ کربلا کا خونی معرکہ چاروں طرف تیغوں کی جھنکار کمانوں کی کڑک زمین گرم پر لہو کے تھالے، اور پھر بنی ہاشم کے شیروں کی لاشیں نظر کے سامنے معاذ اللہ حسین ہوں یا علی اکبر خون حیدری رگوں میں جوش زن ہوگا۔ آنکھیں خون آلود۔ ہاتھ شمشیر زنی کے لیے متحرک اور گلا کٹ جانے کے لیے تیار ہوگا۔ اس پر طرہ یہ کہ وقت عصر، سوائے مرثیے کے اور کسی کے قلم کو تو جرأت ہو نہیں سکتی تھی کہ ماحول بدل دے۔ لیکن کمال نظم بھی ہے کہ سنتے وقت ان مضامین سے سامع کا خیال کسی دوسری طرف منتقل نہیں ہوتا اور لامحالہ متاثر ہو جاتا ہے۔

ہم نے اوپر عرض کیا ہے کہ عورتوں کی تحریک و تحریص سے مردوں کے جنگی ولولے بہت تیز ہو جاتے ہیں۔ اس منظر کو مرثیے نے یوں پیش کیا ہے۔ دیکھیے دہم محرم کو اپنے فرزند علی اکبر کو معرکہ

اہتمام جنگ دیکھ کے۔

جو پوچھتی تھیں کبھی بانوئے امام زماں
یہ کیا سبب ہے کہ ہوتا ہے جنگ کا ساماں
تو عرض کرتے تھے یہ دست بستہ اے اماں
تمام اہل جہاں ہیں عدوئے شاہ جہاں
عوض میں شاہ کے شمشیر و تیر کھائیں گے
لہو پدر کے پسینے پہ ہم بہائیں گے

ماں کا محرکِ شجاعت جواب:۔

وہ کہتی تھی کہ مرے وضعدار کیا کہنا
سپاہیوں کو جراحت ہے پھولوں کا گہنا
اُمید دل کی بر آنا ہے خون کا بہنا
ہمیشہ سینہ سپر آگے باپ کے رہنا
جو تم نے پائی ہے عزت وہ کس نے پائی ہے
یہ بات شروع ہی جو کنبے میں ہوتی آئی ہے

(رشید)

اردو مرثیے میں جنابِ زینبؑ کی ذات سے کسی دلچسپ باب کا اضافہ نہیں ہوا جس سے قوتِ تخیل میں ہیجان پیدا ہو جائے اور پڑھنے والے مبہوت ہو جائیں۔ البتہ ان کے فرزند عونؑ و محمدؑ نے استحقاقِ علمبرداری کے معاملے میں جس جذبے سے کام لیا ہے اور جنابِ زینبؑ نے جس موقع شناسی سے اُن معصوموں کے صحیح جذبات کو مادرانہ شفقت سے دبایا ہے۔ وہ منظر دلوں کو سینے میں تڑپا دیتا ہے اور اِن کی انسانی عظمت کو دو چند کر دکھاتا ہے۔

وہ بچے یعنی عون و محمد جعفر طیار کے پوتے تھے۔ جن کی

علمبرداری پر آج عالمِ اسلام ناز کرتا ہے، جب دونوں نے یہ سُنا کہ امامِ حسینؑ نے عہدۂ علمبرداری جنابِ عباس کو مرحمت فرمایا ہے، جو اُن کا آبائی حق تھا۔ بچے تو تھے، چاند سے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں، حور نشار چہرے مرجھا گئے، اور پیچ و تاب کھا کے رہ گئے۔ ماں اور ماموں کا ادب مانع تھا، ورنہ جعفرِ طیار کے نہنگ اسد اللہ کے شیروں سے اُلجھ پڑتے۔ سب سے الگ بیٹھے آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے اس وقت جنابِ عباسؑ خیمے میں تشریف لاتے ہیں۔ اہلِ حرم عہدۂ جدیدہ کی مبارکباد پیش کرتے ہیں سب کے بعد:

زینب بلائیں لے کے یہ کہتی تھی بار بار — منصب مبارک اے شہِ مرداں کی یادگار
کہتے تھے ہاتھ جوڑ کے عباسِ ذی وقار — مجھ کو سمجھیے عونؑ و محمدؑ کا جاں نثار
اُن کی طرف سے مہتمم بندوبست ہو — مالک یہ شاہزادے ہیں میں پیش دست ہو

(مرثیہ: "جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج")

انیس مرحوم نے چوتھے مصرعے میں جذبات کی ایک دُنیا پیش کر دی ہے اور حق یہ ہے کہ مرثیہ اُس فطرت نگار پر جتنا ناز کرے بجا ہے۔ اس مصرعے میں غور کرنے والے کے لیے سبھی کچھ ہے۔ اولادِ جعفر کی موجودگی میں عدمِ استحقاق علمبرداری کا اعتراف۔

اس جلیل القدر عہدے کی ذمہ داری کا اظہار، عون و محمد کی کمسنی کی طرف اشارہ، اور سب سے بڑھ کے بہن کے عورت ذات ہونے کا احساس کہ کہیں ایسا نہ ہو دل پر میل آجائے۔ کہ میرے بچوں کا حق سوتیلے بھائی نے چھین لیا۔ کیا اسی ذلت کے لیے عبداللہ نے اپنے فرزندوں کو حسینؑ کے ساتھ کیا تھا۔ ہائے انیسؔ لکھنو تجھے کہاں سے لے آئے ؟

اب شاعرانہ فکر، لطیف تر منزل پر پہنچی ہے۔ کہتا ہے عباس کو امتیاز علمبرداری ملنے پر ؎

سب خوش تھے خیمۂ شہِ ذیجاہ میں مگر چین جبیں تھے زینبِ ناشاد کے پسر
نے جانبِ علم تھی نہ ماں کی طرف نظر آنکھوں میں ڈبڈبائے تھے آنسو جھکے تھے سر
اس طرح تھا عرق رخِ پُر آب و تاب پر جیسے پڑے ہوں قطرۂ شبنم گلاب پر

اس سے زیادہ اُن نوعمروں کی جذباتی تصویر کون پیش کر سکتا ہے۔ جو بچے تمدنِ عرب کے ماحول میں پلے بڑھے ہوں نہ کسی سے اپنے حقوق کی پامالی کا شکوہ کر سکتے ہوں نہ گلہ جس چیز کا اظہار کر سکتے تھے وہ یہ تھا کہ نرگسی آنکھوں میں کچھ نمی۔ آتشیں رخسار پر اندرونی تعب کے ظاہر کرنے والے چند پسینے کے قطرے ہائے! اور تیسرا مصرعہ ؏ نے جانبِ علم تھی نہ ماں کی طرف نظر۔

نہ معلوم کیا کہہ رہا ہے۔ علم کی طرف نظر نہ کرنا یہ بتاتا ہے۔ ہمیں علم نہ ملا
تو کیا ہوا۔ ہماری کوئی شان گھٹ گئی۔ زمانہ جانتا ہے کہ عونؑ و محمدؑ
علمبردار رسول جعفر طیار کے پوتے ہیں۔ اور ماں کی طرف نہ دیکھنا
تو شکایت فرزندانہ کا ایک قیامت خیز ہنگامہ پیش کر رہا ہے۔ ننھے دل
کہہ رہے ہونگے۔ امی تم نے اپنے میکے والوں کی پنچ کی اور سسرال کے
خاندانی اعزاز کی طرف توجہ نہ کی۔ ہم تمہارے دودھ سے پرورش نہیں
ہوئے تھے کہ اپنے آبائی حقوق کو ننھیال والوں سے پامال کرا دیں۔
اچھی امی! تم سے ہمیں یہ اُمید نہ تھی۔ ہم تو تمہاری آنکھوں کے تارے تھے۔
تم کو ہمارا مستقبل روشن کرانا تھا نہ کہ اس زیادتی پر خاموش رہ کے
اور تاریک بنا دیا۔

ادھر بچوں کے خیالات میں محشر جذبات بپا تھا۔ اُدھر زینبؑ
باامام حسینؑ اور دوسرے اعزا سے اسی سلسلے میں مصروف گفتگو تھیں۔ یا تو
عمداً ٹال رہی تھیں۔ یا پھر یہ مقصد ہو گا کہ اس عہدۂ علمبرداری کے
سلسلے میں عونؑ و محمدؑ کے احساسات کی جانچ مقصود تھی۔ بہرحال جب خبر
[illegible] پہنچے انہوں نے یہ غیر معمولی خاموشی پائی تو فطرتاً
[illegible] سمجھیں علم نہ ملنے سے بددل ہیں [illegible]
آئے عقب سے شہ کے سعادت نشاں پسر [illegible] ادھر

قربان جاؤں کیا ہے جو جگر اور اس میں — بولیں کہ اب نہ ہوش نہ مجھ میں حواس ہیں

اس بند میں ہزاروں قسم کی ذمہ داریاں رکھنے والی ماں کا سب سے الگ اپنے فرزندوں کو اشارے سے بلانا تاکہ افشائے راز نہ ہو جائے اور بچے بے ادب کہلائیں۔ پھر اطاعت گزار بھائی عباس کا خیال سب سے زیادہ حسین کی بزرگداشت پر نظر۔ بچوں کا سامنے سے نہ آنا بلکہ پشت کی طرف سے۔ یا تو اور یا اس خوف سے کہ قیافے سے ماموں تاڑ نہ جائیں۔

کیسے کیسے نازک موقعوں پر انیس نے قلم اٹھایا ہے اور عہدہ برآ ہوا ہے۔ سب کے بعد بیت پڑھیے اور دیکھیے کہ ماں نے اپنی پریشانی کا اظہار کر کے بچوں کی موجودہ اور آئندہ جذبات انگیزی کا سدباب کر دیا ہے۔ قاعدہ ہے کہ نیک اولاد خصوصاً ماں کو پریشان دیکھ کے اپنی تمام ذہنی کشمکشوں کو بالائے طاق رکھ دیتی ہے اور اپنے درد دکھ بھول جاتی ہے۔

جنابِ زینب بچوں سے اس مضمون پر گفتگو ہی نہیں کرتیں جس کو وہ اہم سمجھے ہوئے ہیں۔ اور انجان بن کے سوال کرتے ہوئے فرزندوں کا خیال معاً ایک سمت ... یعنی تہیۂ قتال کی طرف پھیر دیتی ہیں اور اسی وقت ... بچوں کو بغیر کہے یہ سمجھانا تھا کہ علم و علم کا سوال ... ماموں کی حمایت ہے اس کے لیے ...

ہتھیار سج چکے ہیں شہنشاہِ حق شناس — تم نے ...

مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس | دولھا بن کے جاؤ امام اُمم کے پاس
کچھ بھی ملا ہے بیاہ میں آؤ میں کپڑے اتار دوں | سُرمہ لگا دوں گیسوئے مشکیں سنوار دوں

امام حسینؑ کو حق شناسی کی صفت سے موصوف کر کے بچوں کو عدالت امام یاد دلا دی کہ عباسؑ کو تم پر ترجیح دیکے عَلَم کسی حق ہی سے دیا ہوگا۔ جو شجاع اصیل ہیں انھیں زینت و فخر کے لیے اسباب ظاہری کی ضرورت نہیں لہٰذا۔ خود بکتر، زرہ و چار آئینہ کو لباس فاخرہ سے تعبیر کیا ہے سے
مردوں کو جان دینے میں ہوتا نہیں ہراس۔ کہہ کے شاعر نے جناب زینبؑ کی غیرتِ نسائیت کو جگا دیا ہے۔

باقی تین مصرعے ہندیت خیالی میں ڈوبے ہوئے ہیں۔
دیکھیے ماں بیٹوں کے جذبات کی گرمی سے کتنی ملی ہوئی ہے اور شاعر کا قلم بھی اسی تسلسل کے ساتھ کھنچا جا رہا ہے! اور کمال کر رہا ہے۔

جناب زینبؑ فرزندوں سے کہتی ہیں۔ میں تو سمجھتی تھی اللہ رکھے تم خود سمجھدار ہو سے اب کیا ہوا یہ کونسے غصّے کا ہے محل۔

اس کا نہیں خیال کہ کیونکر جیے گی ماں | ہو تم جیسے فرزند ہیں محبت کا امتحاں
تم میری جان دس برس کی ہو ہو میری جاں | مجھ سے سوا ہے کون تمہارا مزاج داں
جس بات پر بگڑتے ہو وہ سب جانتی ہوں میں | غصّے کی آنکھ گھڑ کے کو پہچانتی ہوں میں

فقط اس لیے کہ بچوں کی ہجر اس نکل جائے۔ اُن سے کہتی ہیں کہ مجھ سے

الگ چل کے کہدو" کاہے کی خفگی ہے ؟

یہ سُن کے زینب کے نونہال دل پر تے ہیں اور نہرِ لبن سے دھوئی ہوئی زبان میں ماں سے ماموں کی شکایت کرنے لگتے ہیں کہ انکو اوروں کی پرورش منظور ہے اور ہمارا خیال نہیں۔ چاہے دیتے نہیں لیکن ہم کو عہدۂ علمبرداری کے سلسلے میں پوچھتے تو سہی !

کیا وارثہ دارِ جعفرِ طیار ہم نہ تھے
اس عہدۂ جلیل کے حقدار ہم نہ تھے

ذیل کے دو تین بند مرثیے کے عرشِ کمال پر پہنچ جانے کا ثبوت دیتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ انیسؔ جذبات نگاری اور موقع شناسی کے جیتے جاگتے مرقعے کھینچ کے رکھدیتا ہے اور اس معاملے میں دنیا کا کوئی شاعر اُس کا دامن تک نہیں چھو سکتا۔ (میں تشریح کرکے مضمون کو طویل نہیں کرتا خود غور فرمائیے۔ جنابِ زینب اپنے خون کے تیوروں سے جذبۂ شکایت کو یوں فرو کرتی ہیں۔

انگشت رکھ کے دانتوں میں ماں نے کہا کہ ہا
اب اس کا ذکر کیا ہے جو ہونا تھا ہو چکا

دیکھو سُنیں نہ زوجۂ عباسِ باوفا
اچھا یہ ہے خوشی کی جگہ یا گلے کی جا

غبطہ نہ اس میں چاہیے جو امر خیر ہو
داری وہ کون غیر ہے تم کو اب غیر ہو

پھر کہتی ہیں کہ اک دو پہر کے واسطے ناحق یہ قیل وقال۔ یہ قصہ چھوڑو اور حسینؑ پر جاں نثاری کے لیے آمادہ رہو۔ عصر تک خاتمہ ہے۔

اللہ اللہ۔ خیر سلا۔

تو اپنے دودھ کی قسمیں دیتی ہوں میں قسم | اب کچھ کہو گے منہ سے تو ہوگا مجھے بھی غم
سنتے تھے تم ا جو کہتے تھے عباسِ ذی حشم | فرزند اُن کو جا کے تہنیت عہدۂ علم
صدقے گئی خلافِ ادب کچھ سخن نہ ہو | میری خوشی یہی ہے کہ جبیں پر شکن نہ ہو

تسلسلِ نظم ایسا ہے کہ دو بندوں کے درمیان ایک لفظ کی گنجائش نہیں۔ بہر طور بچے سنجیدہ جواب دیتے ہیں اور ماں سے معذرت کے خواہاں ہوتے ہیں۔

بھنے سے ہاتھ جوڑ کے بولے وہ نونہال | ہم باوفا غلام ہیں کیا تاب کیا مجال
دیجیے ہمیں سزا جو بل ابرو پہ کچھ پڑیں
کہیے تو چھوٹے ماموں کے قدموں پہ گر پڑیں

ماں اس سعادتمندانہ روش کی داد دیتے ہوئے فرماتی ہیں:۔

زینب بلائیں لے کے یہ بولیں کہ میں نثار | دونوں ہو تم سعید و رشید و وفا شعار
دے ایسے بیٹے سب کو زمانے میں کردگار | ذی قدر و ذی شعور و سخن سنج و ذی وقار
لازم خوشی ہے جو جسے عہدہ سپرد ہو | چھوٹوں کے تم بزرگ بزرگوں کے خرد ہو

اتنا طویل قصہ مرثیے کی جناب زینب نے کس حسن و خوبی اور اختصار کے ساتھ طے کر دیا۔ کہ سبحان اللہ۔ اس کے بعد بھائی کے سامنے اپنے دونوں فرزندوں کو قربانی کے لیے ان الفاظ میں پیش کرتی ہیں۔

باپ ان کا آج ہوتا جو شاہِ زماں
کرتا قدم پہ سر کو تصدق ہے تو جاں

ایک ان کے بدلے آپ کے فرزند ہیں تمام
پھر بھی یہ لیئے فدا کرنا اپنی جان

ان پہ ہمارا حق ہے تمہیں حق آپکا
بیٹھی تو یہ ادا کریں حق اپنے باپ کا

اس کے بعد دونوں فرزندوں سے میدان میں تلوار چل رہی ہے اور ماں در خیمہ سے دیکھ رہی ہے لیکن بجائے طویل حزن و ملال کے ایک عجیب جذبہ کارفرما ہے جس کو انیس کا آئینہ یوں دکھاتا ہے:

حال یہ دیکھ کے زینب کا ہوا جان تباہ
رنگ فق ہو گیا دلگیر ہوا صدمہ جانکاہ

پھر دعا حق سے یہ کرنے لگیں بایں واہ
دیکھو عزت مرے فرزندوں کی یا رب اللہ

صدقے ماں ہو نہ یہ دو روز کے پیاسے ہو جائیں
فوج میں قید نہ حیدر کے نواسے ہو جائیں

(مرثیہ: عمل ۱۲۷۲ عون و محمد زینب کے سر سے آتی ہیں)

اس بند کا آخری مصرعہ "فوج میں قید نہ حیدر کے نواسے ہو جائیں" اعلیٰ ترین عزت خاندانی کا نقشہ پیش کرتا ہے فرزندوں کے قتل کی کچھ پرواہ نہیں بنی ہاشم کی گذشتہ روایاتِ شجاعت کے برقرار رکھنے کا خیال پیش پیش ہے۔ اسکے بعد فرزندوں کی جنگ دیکھنا بھی نہیں چاہتیں نظر پھیر کے خیمے میں واپس جاتی ہیں یہاں تک کہ علی اکبر پھوپی کی خدمت میں آتے ہیں اور یہ کہہ کے عون و محمد کے قتل کی جگر خراش خبر سناتے ہیں:

اے پھوپی قتل ہوئے آپ کے پیارے دونوں
گر پڑے برجِ شرافت کے ستارے دونوں

کیا سننا تھا کہ دکھیاری ماں سر و سینہ پیٹنے لگی کلیجہ منہ کو آ گیا۔

ہوش و حواس اڑ جاتے رہتے۔ مگر اس مقام پر دیکھنا ہے کہ جناب زینب کے صبر و اطمینانِ قلب میں انسانیت کے اس بدترین حادثے سے کوئی فرق آیا نہیں۔ محترم قارئین! ایک لمحہ اپنی نظر کو سکون دینے کے بعد فوراً ذیل کا بند پڑھیں اور خود اندازہ فرمائیں کہ سوائے زینبؑ (خواہر شہید کربلا) کے کسی دوسری خاتون کو اس موقع پر ایسے خالص شکرِ خدا کے لیے نصیب ہو سکتے تھے۔

یہ خبر سنتے ہی تھرانے لگی زینب زار | اُڑ گیا رنگ مگر روئی نہ وہ بے کس و زار
جھک کے سجدے میں کہا میں تیری قربان گئی | سرخرو مجھ کو کیا پیشِ رسولِ مختار
صدقے زہرا کی کمائی یہ کمائی میری | شکر کرتی ہوں کہ اُمید برآئی میری

ایسے جذبات پر اس طرح قابو پا لینا ہر ایک کا کام نہیں یہیں سے اندازہ رہ جاتی کی تشریح ہو جاتی ہے۔ جناب زینب اپنے مہ پاروں کے قتل پر ذرا بھی نہ روئیں لیکن دنیا کے حساس دلوں کو رُلا گئیں اور اس کرۂ خاکی کے آخری دور تک رُلاتی رہیں گی۔

جناب زینبؑ کی عظمتِ عرفانی کا نشان ایسے ہی حادثات کے موقع پر ملتا ہے۔ اور آزمائشِ قدرت کی کسوٹی پر پوری اُترتی ہیں۔ یہی ہوتا چلا آتا ہے:

ہر کہ درین بزم مقرب تر است | جامِ بلا بیشترش می دہند

ہندی نقطۂ نظر ہی سے سہی لیکن جناب زینب کے کردارِ حسنہ کا جہاں کہیں ذکر ہوگا اُسے بلیغ کرنے کی ضرورت نہیں خود اُن محترمہ کا اعلیٰ کیرکٹر اُسے مکمل کرنے کا ذمہ دار ہو جاتا ہے۔

مذکورہ بالا چند بندوں میں تعلقاتِ عزیزانہ پر نظم، معاملے کی نزاکت یہ
قدرت اور مدارجِ محبت کے ماتحت اُس کا تصفیہ، پھر آخر میں اپنے خاص مضمون
یعنی قربانی راہِ خدا کے ذکر بہ اہتمام ایسا مکمل نظمی مرقع ہے جس نے واقعاتِ
کربلا کو اپنے ماحول میں سمیٹ کے زمینِ ہند کو ارضِ کربلا بنا دیا ہے۔
سچ کہا ہے تمدنِ عام شعر کی مختلف نوعیت کا ذمہ دار ہوا کرتا ہے جس کو
شاعر کے ذاتی رجحان سے کوئی علاقہ نہیں جیسا مشہور ہے شعر اپنے زمانے کا ترجمان ہوتا ہے۔

ہندی رسومات

نوابینِ اودھ شیعہ مذہب رکھتے تھے۔ رعایا بھی کم و بیش اُسی رنگ میں
رنگی ہوئی تھی۔ ہر شعبۂ حیات میں ایجاد و اختراع تو لکھنؤ والوں کا خاصہ ہے
چنانچہ اکثر رسومات مذہب امامیہ دورِ سلطنت کی پیداوار معلوم ہوتی ہیں بہت سی
زوالِ دولت کی نذر ہو گئیں، چند اس وقت بھی پائی جاتی ہیں لیکن بہت دھندلے
رنگ میں۔ جیسے فریادی ماتم ٹھیک دوپہر کے وقت۔
تعجب یہ ہے کہ اس روشن خیالی کے زمانے میں بھی لکھنؤ میں بعض ایسی
رسموں کا وجود باقی ہے جنھیں زوالِ سلطنت کے بعد مٹ جانا چاہیے تھا۔
مثلاً حسینیہ غفراں مآب کے پاس ایک جدید امام باڑے میں اعتقادی دباؤ
سے جنت کی کھڑکی پھوٹ نکلی۔ وغیرہا
ہمارے قائدینِ ملت بیٹھا دیکھا کرتے ہیں اور عوام بےخبری کی رَو میں بہے چلے جاتے ہیں۔

شمس العلماء مولانا سید ناصر حسین صاحب مغفور کی روح پاک غریق دریائے رحمت ہو جنہوں نے بعض رسوم روئیہ کی اصلاح کر کے ہمیشہ کیلئے قوم پر عظیم احسان کیا ہے۔ مثل عقد جناب قاسم کی مخالفت۔ یا رسول اللہ کی منسوب بر غلط منبر وغیرہ۔ مغفور نے کئی معرکے ان کی خاطر زندگی کا ذکر کیا۔ لیکن عقد قاسم کی روایات کو غلط ثابت کر کے جناب مغفور نے اس سلسلے کی بیسیوں بیہودہ سے نجیبدہ مردوں اور عورتوں کو نجات دلادی اور اب یہ نوحہ شاذ و نادر ہی سنائی دیتا ہے:

اس کو مجرا جو کہتی تھی مادر بہندی آتی ہے قاسم بنے کی

کاش علامہ مغفور چند کتابیں اردو میں تصنیف کر جاتے جو عوام کے لیے چراغ ہدایت کا کام دیتیں۔ عبقات کون پڑھتا ہے؟

علامہ شبلی اور علامہ ناصر حسین

حضرت شمس العلما مولانا شبلی مرحوم جنہوں نے اپنی تالیفات اردو سے بڑے بڑے مذہبی اور ادبی کام کیے ہیں۔ ایک مرتبہ لکھنؤ حضرت شمس العلما مولانا سید ناصر حسین صاحب قبلہ سے ملنے تشریف لائے۔ آپس میں بے تکلفی تھی۔ مولانا شبلی نے اپنے زانو پر ہاتھ مار کے فرمایا: "اے مولوی ناصر حسین! علم کا یہ گنج شایگاں تم اپنے سینے میں رکھ کے ساتھ لیجاؤ گے اور کسی کو خبر بھی نہ ہوگی" کہا تھا۔ خدا کے لیے اردو میں تصنیفات و تالیفات کرو کہ مخلوق خدا کو

نفع پہنچا اور اس دونِ ہمتی کے خیال کو چھوڑ دو۔ زمانہ آ رہا ہے کہ عوام اُردو کے سوا اور کچھ نہ پڑھ سکیں گے۔

اس وقت مولانا سید علی نقی صاحب تو اُردو میں تالیفات کر ہی رہے ہیں۔ اُمید ہے کہ مولانا سید محمد سعید صاحب بھی اس طرف توجہ فرمائیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ علما بھی کیا کریں مسلمانوں میں مذہبی اور معاشرتی تعلیم کا فقدان ہو گیا۔ اسلاف کی روایات سے وہ بالکل بے خبر ہیں۔ مغربی رنگ ہے کہ مردوں اور عورتوں پر چھایا چلا جا رہا ہے سو اب فی ناصح دیکھتے ہیں اور دم بخود رہ جاتے ہیں کس سے کہیں کیا کریں۔ عالم یہ ہے کہ بیکن اور اسپنسر جو کہہ دیں وہ درست لیکن غزالی و رازی طوسی و بہائی کے اقوال پر سکوت۔

اللہ بھلا کرے حسینی مشن لکھنؤ کا جو ضرورت وقت کے مطابق تالیفاتِ اُردو کی اشاعت کر رہا ہے۔ خدا کرے اس کے صحیح اثرات سنجیدہ طبقے سے آگے بڑھ کے مجہول العقل میاں شبراتی اور خیراتی تک پہنچ جائیں۔ جہاں سے مضحکات پیدا ہوتے ہیں۔

عبادت و ریاضت جناب زینب

ارباب معرفت کے نزدیک عبد خاص وہی ہے جو معبود شناس ہو۔ چنانچہ انبیا و اولیا کے درجات ارتقائی کے لیے یہی ایک کسوٹی ہے۔ ایسی ہی عبدیت کو درجۂ نبوت پر

مقدم رکھا گیا ہے اور جناب عیسیٰؑ کے اس قول کو استدلال میں پیش کیا جاتا ہے
إِنِّي عَبْدُ اللّٰهِ آتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِي نَبِيًّا (میں اللہ کا بندہ ہوں۔ مجھے معبود نے انجیلِ مقدس عنایت فرمائی ہے۔ اور نبی قرار دیا ہے) دوسرے اہلِ تحقیق نے عبودیت کی اس طرح جامع و مانع تعریف کی ہے العبودیۃ جوھرۃ کنھھا الربوبیۃ (عبودیت وہ جوہر ہے جو ربوبیت کے پردۂ راز میں پنہاں ہے) لیکن بابِ مدینۃ العلم کی نظرِ عبودیت عین الیقین کے اُس آخری نقطے تک پہنچ چکی تھی جہاں مسئلہ حجاب بے حجاب ہو گیا تھا:

پہنچی نگاہِ شوق تمہیں توڑتی ہوئی
جتنے ترے حجاب تھے بیکار ہو گئے۔

بہرحال جناب زینبؑ بھی اُسی سلسلۂ عبودیت کی ایک کڑی تھیں جس پر عین عبادت کو ناز ہے۔ چنانچہ حسب تحقیق ثقۃ الاسلام علامہ محمد باقر (صاحب کبریت احمر) امام زین العابدینؑ ارشاد فرمایا کرتے تھے: "کربلا سے شام تک سفرِ اہل بیتؑ ایک نمونۂ قیامت تھا۔ لیکن میری عبادت گزار پھوپھی جناب زینبؑ کی نمازِ شب کبھی قضا نہیں ہوئی۔" اس خبر کی تصدیق شہیدِ کربلا کے اُس وداعی فقرے سے بھی ہوتی ہے جس کے بعد زینبؑ کے کانوں نے پھر وہ آواز نہ سنی۔
یا اختاہ لا تنسینی فی نافلۃ اللیل (بہن مجھے نمازِ شب میں نہ بھولنا)

گریۂ زینبؑ

حضرت ختمی مرتبت کا ارشاد ہے لو تعلمون ما اعلم لضحکتم قلیلاً و لبکیتم کثیراً (کتاب الرقاق بخاری) مسلمانو! اگر تمھیں میری طرح

علم ذوالجلالی ہوتا تو تم ہنستے کم اور رویا بہت کرتے۔ خیر یہ تو خوفِ خدا سے رونا ہے۔ لیکن فطرتِ انسانی ہے کہ مظلومیت خراجِ اشک لیے بغیر نہیں رہتی اور مستحقِ حزن و ملال وہی شخص ہو سکتا ہے جو ظلم کی طاقت سے کچل کے مظاہرۂ صبر کر دکھائے۔ حسنینؑ کے حقوقِ مظلومیت کا پہلو میدانِ کربلا میں بہت روشن نظر آتا ہے۔ یہاں اس عنوان سے طوالت مقصود نہیں صرف عرض کرنا ہے کہ خواہرِ امامِ مظلوم نے شدائد برداشت کیے لیکن بھائی کے قتل نے عنانِ صبر ہاتھ سے چھین لی۔ حسینؑ سے ابتدائی عمر سے غیر معمولی خواہرانہ محبت کی اور اسے آخری دم تک نباہ دیا جسکی نظیر دنیا کے کسی خاندانی تعلقات میں نہیں ملتی۔ بھائی کو بھی اس مظلومہ بہن کی محبت کا آخری احساس اُس وقت ہو چکا تھا جبکہ اُسکی آنکھیں اپنے فرزندوں کے غم میں نم تک نہ ہوئیں لیکن قتلِ برادر کے بعد آنکھوں سے اشکوں کے دریا بہ گئے۔ جب تک زندگی نے وفا کی بھائی کے غم میں سوگوار رہیں۔

پردۂ جنابِ زینبؑ

عرب کے دستور کے موافق خواتینِ بنی ہاشم میں پردے کا وہی طریقہ تھا جیسا قرآن و حدیث کا حکم ہے "لیضربن بخمرھن علی جیوبھن" حاشیہ بخاری میں حسبِ تحقیق فراء۔ ایامِ جاہلیت میں مستوراتِ عرب اپنے جسم پر آنچل اس طرح لپیٹتی تھیں کہ پشت کا نصف حصہ ڈھک جاتا تھا اور سینے کا حصہ کھلا رہتا تھا۔ اسلام نے عورت کے جسم کے اگلے حصے کو ڈھکنا مقدم سمجھا تو رسمِ جاہلیہ کو پسِ پشت ڈال دیا۔ چنانچہ ربّ العزت نے بھی نصِ قرآنی کے ذریعے

اس جیسی رسم پر پردہ ڈال دیا۔

ہندوستان کی عورتوں میں جس پردے کی بنیاد پڑی اُسکی عجیب نوعیت ہے اور وسیع اسباب ہیں۔ تیس چالیس برس قبل عورت کے انتہائی شرم و حجاب کیلئے یہ الفاظ استعمال ہوتے تھے۔ فلاں بی بی اُسی چار دیواری میں ہی دفن کی مانی جاتی ہے نہ ملنے اصل تو یہ ہے کہ گزشتہ پردے کی سختی کا ردِ عمل اب بے پردگی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے۔ دوسرے مغربی تہذیب کی آزاد ہواؤں نے بیگم کے گھونگھٹ سے کھیل بازیاں شروع کر دی ہیں۔

کاش ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کے زوال کے بعد یہ مغربی خطرہ محسوس کر لیا جاتا اور اُس پردہ عرب کی پابندی شروع کر دی جاتی جس کی طرف آج توجہ دلائی جا رہی ہے۔ اِلَّا مَا ظَهَرَ مِنْهَا۔

خواتینِ عرب کا پردہ تو یہ تھا کہ ایک مقنع اور ایک چادر۔ یہ ہندی برقع او بقول شخصے "چلتے پھرتے تنبو" جسکے ڈھکاؤ سے عورت کی چربی گھلنے لگتی ہے۔ عرب میں کہاں دیکھا تماشا یہ کہ برقعے کے بیلدار کنارے زمین پر جتنے زیادہ محکمہ صفائی کی مدد کریں اُتنے ہی زیادہ محافظِ عصمت سمجھے جاتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ جذبۂ شرم و حیا پردہ دل سے پیدا ہوتا ہے اور نظروں پر چھا جاتا ہے۔

جناب زینبؑ نے جس وقت مدینے سے قافلۂ حسینؑ کے ساتھ

کو یہ فرمایا ہے اُسی وقت سے اُنکے لیے اہتمامِ پردہ کی روایات ملتی ہیں نیز
علی بن ابی طالب کے وقت میں جس وقت یہ خاتون روضۂ رسولؐ پر پڑھنے
فاتحہ شب کو تشریف لیجاتی تھیں تو حسنؑ یا حسینؑ کے ہمراہ اور بحکمِ حیدری
صحنِ مسجد کی روشنی گل کر دی جاتی تھی۔
عالمِ اضطرار و بیچارگی میں اگر کسی خاتون کو پردے کا خیال نہ رہے تو یہ دوسرا امر ہے
لیکن عمداً اُسکی طرف توجہ نہ کرنا تمدنِ اسلام کے منافی ہے۔ جنابِ زینبؑ
کے متعلق لکھا ہے کہ وقتِ شہادتِ حسینؑ خیمے سے نکل آئی تھیں جس کا
احساس خود حسینِ غیور کو ہوا اور جب خیموں میں آگ لگی تو سید سجادؑ کے
پاس گئیں اور کہا کہ تم اس وقت قائدِ اہلبیت اور نائبِ امام ہو کیا حکم ہے۔
فرمایا: "عَلَیکُنَّ بالفرار" مجبوری ہے خیموں سے باہر نکل جاؤ۔ کیا کوئی
عورت ایسے وقت مرد سے پوچھتی ہے؟ بظاہر جنابِ زینبؑ کی یہ اضطراری
کیفیت تھی لیکن جہاں اختیار تھا وہاں اُن مخدرہ کو خود اپنے پردے کا ضرور
خیال تھا۔ قیل دخلت زینبؑ علی ابن زیاد وھی تستر وجہھا
بکمّھا لانّ قناعھا قد اُخِذَ منھا۔ (جب جنابِ زینبؑ ابن زیاد کے سامنے
گئیں تو اپنے چہرے کو آستین سے چھپا رہی تھیں کیونکہ مقنع چھن چکا تھا۔)
ایک عجیب خواب | صاحب خصائصِ زینبیہ نے ثقۃ الاسلام محمد باقر اعلی اللہ
مقامہ کا ایک خواب پردۂ اسیرانِ اہلبیت کے متعلق نقل کیا ہے جو

نظرِ توجہ کا خواستگار رہے۔ لکھتے ہیں:
"میں نے عالمِ خواب میں دیکھا کہ منبر پر ایک واعظ سیرتِ اہلبیتؑ
کے متعلق کچھ بیان کر رہے ہیں۔ دورانِ بیان میں کہنے لگے۔ نہ معلوم اہلبیتؑ
کے چہرے کھلے ہوئے تھے یا ڈھکے ہوئے تھے۔ میں نے دیکھا کہ خود صدیقۂ صغراؑ
اور تمام اسیرانِ کربلا حاضرِ مجلس ہیں۔ واعظ سے کہا وہ سب خود موجود
ہیں۔ میں پوچھے لیتا ہوں۔ میں نے سوال کیا آیا وہ نہیں کہ جنابِ زینبؑ
یا اُمِ کلثومؑ نے کہا: "مستورہ بودیم و لے لباسِ درستے نداشتیم"

دیانت و امانت داری دنیوی معاملات میں تو جنابِ زینبؑ کی دیانتداری
ان امور سے ظاہر ہے کہ پورے گھر کی دیکھ بھال خرچ اخراجات سب انھیں
کے سپرد تھے۔ علی بن ابی طالبؑ کی خلافت میں تو سب کے سب کسی بیرونی
امداد سے بے نیاز تھے کیونکہ بیت المال سے رقم معینہ ملا کرتی تھی لیکن
بعدِ وفات آنحضرتؐ ایک بڑی سالانہ رقم امیرِ معاویہ کی طرف سے
امامِ حسنؑ کے پاس آتی تھی۔ وہ سب جنابِ زینبؑ کے ہاتھوں خرچ
ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ اُمرائے عرب و عراق کی طرف سے نذرِ امام
اور حقِ امام کی تھیلیاں گھر میں آتی تھیں۔ خود عبداللہ ابن جعفر
کیا کسی سے کم تھے۔ خلاصہ یہ کہ جنابِ زینبؑ نے ۶۱ھ تک بڑی
سیر چشمی اور دیانت سے زندگی بسر کی

اور یہی امانتِ باطنی۔ تو بعض علما نے حضرت زینبؑ کے مرتبۂ روحانی کو امام کے
مرتبے کے قریب تر سمجھا ہے اور بعض نے برابر۔ کیونکہ وقتِ وداعِ حسینؑ
سید سجاد عالمِ ہوش میں نہ تھے۔ جو کچھ رموزِ معرفت و امامت اپنے جانشین کو
تلقین کرنا تھے وہ حضرتِ زینبؑ کو یہ کہہ کے سپرد کیے: "جب میرا فرزند بیدار ہو
اُسکو پہنچا دینا۔" اس صورت میں اُنھوں نے گویا امام کی قائم مقامی کی۔

رسالہ اکمال الدین و غیبت میں شیخ طوسیؒ نے لکھا ہے کہ ۲۶۲ھ میں
علی بن احمد نے حکیمہ خاتون بنت امام محمد تقیؑ سے ملاقات کی اور پوچھا
کہ آپ کا مسلک کیا ہے۔ اُنھوں نے کہا امامیہ (غرضِ ملاقات شاید
یہ تھی کہ امام دوازدہم کے متعلق معلومات حاصل کریں) اور سب اماموں کے
نام لیے۔ ابن احمد نے پوچھا: "امام مہدی کی امامت آپ کو کیونکر معلوم ہوئی
نظر سے یا خبر سے۔" کہا: "راز ہائے امامت امام عسکری اپنی والدہ کے سپرد
کر گئے تھے۔ اس بنا پر کہ امام مہدی صغیر السن تھے۔" پھر پوچھا "وہ حضرت
کہاں ہیں؟" جواب دیا "پردہ غیبت میں۔" پھر سوال کیا "مذہب امامیہ رکھنے
والے احکاماتِ شرعیہ کس سے اخذ کرتے ہیں" کہا "امام مہدیؑ کی دادی
(والدۂ امام حسن عسکریؑ) سے" ابن احمد نے اعتراضاً کہا: "لوگ ایسے شخص
کی پیروی کیوں کریں جس نے خود تو پردہ اختیار کیا ہو اور امام ہو کے
معاملاتِ ہدایت ایک عورت کے سپرد کر دیے ہوں۔" حکیمہ خاتون نے

جواباً کہا: "لڑکوں کو اس معاملے میں سید الشہدا کی پیروی کرنی چاہیے جنھوں نے سید سجاد کو بیہوش پا کے علوم باطنی اپنی بہن زینب کے سپرد کر دیے تھے۔ کہ جب عالمِ اختیار میں میرا فرزند آئے تو پہنچا دینا۔"
اللہ اللہ کیسی کیسی بی بیاں گزری ہیں کہ رازداری میں انبیاؑ و اولیا کی برابری کر گئیں۔

عام خواتین کی رازداری | عام طور سے تو ہماری خواتینِ محترمہ کا یہ عالم ہے، کہ مشکل سے راز کو راز سمجھتی ہیں۔ جہاں آپس میں تھوڑی سی بے تکلفی اور کانا پھوسی ہوئی اور ابل پڑیں۔ ایک بہن نے دوسری بہن سے اتنا کہہ کے سب کچھ کہہ دیا: "بہن کسی سے کہنا نہیں۔ اگر انھیں معلوم ہو گیا تو قیامت ہو جائے گی۔" جواب ملا: "واہ بہن! کیا وہ بندی ڈھنڈورا پیٹتی پھرے گی؟"!
اتفاق سے اگر کوئی بات واقعی صیغۂ راز میں رکھنے کی ہے۔ تو پھر کیفیت نہ پوچھیے۔ پیٹ میں چوہوں کی عملداری ہو جاتی ہے۔ بلبلائی جاتی ہیں کہ کوئی ایسی بھابی بھر کم بہن ملیں جن سے مل کے دل کی بھڑاس نکالی جائے۔ خیر۔
یہی دس بارہ برس کے اندر کی بات ہے کہ مصطفےٰ کمال نے اپنی حسین بی بی لطیفہ خانم.... کو جو فرانسیسی الاصل تھی طرح طرح بنا پر طلاق دیدی

کہ اُس نے ایک سیاسی رازفاش کردیا تھا جس سے جمہوریت کو نقصان کا اندیشہ تھا۔ آخر دم تک: "اے میرے بیٹو! کہتے کہتے مرگئی لیکن ان کے جمالِ ظاہری سے متاثر نہ ہوا۔

خواتین میں جمالِ ظاہری کے ساتھ جمالِ باطنی بھی لازمی شئے ہے۔

حفاظتِ اسلام میں زینب کا حصہ

یہ مسلّمہ امر ہے کہ امام حسینؑ کی شہادت نے رسولؐ کے قائم کردہ نظامِ اسلام کو برقرار رکھا۔ ورنہ یزید کی سلطنت نے جس عنوان سے ابتدا کی تھی اگر اسی طرح سلاطینِ بنی اُمیہ عرب میں حکومت کرتے رہتے تو اسلام نہ معلوم کس بدنما صورت میں مسخ ہوجاتا۔

یزید تھا اور عرب کا صاف چٹیل میدان۔ جہاں تک چاہتا فسق و فجور کا گھوڑا دوڑاتا چلا جاتا۔ وہ تو یہ کہیے کہ اللہ کے پیارے رسولؐ کے دولارے اور فاطمہؑ کے لاڈلے نے ایک خونیں خندق راستے میں کھود دی جس سے اُسکی تمام رعونتیں رُک گئیں ورنہ خود سوچیے کہ کیا ہو گیا ہوتا؟

حسینؑ قتل ہونے کو تو ہوگئے لیکن اُسی کے ساتھ قبائلِ عرب میں اثراتِ مابعد نے ردِ عمل شروع کردیا اور خاندانِ بنی اُمیہ کی طرف سے مرجعیتِ عامہ زائل ہونے لگی۔ خود یزید کی بقیہ مختصر زندگی اسی اودھیڑبُن میں گزری کہ بدنے والوں کو کیونکر موافق بنایا جائے۔ ادھر محبانِ آلِ رسول میں اندر اندر انتقام کی آگ سلگ رہی تھی۔ موتِ یزید کے بعد سلیمان

تھا۔ دو اہم نتائج پیدا ہوگئے۔ دوسرے ذکرِ حسینؑ کے سلسلے میں منبروں پر سلطنتِ اُمویہ کے خلاف پروپیگنڈا ہونے لگا جس نے آخر کار اُس کا تختہ اُلٹ ہی کے چھوڑا۔

استقلالِ زینبؑ

قتلِ حسینؑ کے بعد ایسے سکون و استقلال سے کام لیا کہ جس کی نظیر نہیں۔ دوسری عورت ہوتی تو حواس باختہ ہوجاتی۔ اُدھر فوجِ یزید کی خیامِ اہلِ بیتؑ پر یورش۔ بیمار فرزندِ حسینؑ کی حالت غیر ہو رہی تھی۔ درِ خیمہ پر سواروں کا ہجوم کیونکہ سب کے والی وارث کی لاش سامنے پڑی تھی لیکن واہ ری زینب خاتون اپنا غم بھول گئیں اور سب کو سمیٹے بیٹھی رہیں۔ دربارِ ابنِ زیاد میں تو آگے آگے مجلسِ یزید میں داخل ہوئیں تو بیٹھ گئیں۔ جیسے واپس آئیں تو بھی صفِ ماتم میں بیٹھنے والوں کو تسکین و دلاسا دینے کا کام انھیں کے سپرد تھا۔ خلاصہ یہ کہ خود کو بھول گئیں اور سب کو یاد رکھا۔

سب سے زیادہ قابلِ نظر یہ امر ہے کہ نصیحت و تلقینِ صبر میں سنجیدگی کے پہلو کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ چنانچہ جب اسیروں کا قافلہ چلنے لگا تو سیدِ سجاد لاشِ پدر کے پاس آکے شدید غم و الم کا مظاہرہ کرنے لگے تو یہ بڑھیں اور (حالت بقیۃ بین جسد الحسین الخ) درمیان حائل ہوکے بولیں (بیٹا اللہ تمھیں رکھے کیوں ہلکان ہوئے جاتے ہو۔)

زینبؑ اور حاکمِ کوفہ سے دلیرانہ گفتگو

کوفے میں مجلسِ ابنِ زیاد میں پہنچ کے بلند و مستقل

آپ نے فرمایا: غُضُّوا اَبصَارَکُم عَنَّا (آنکھیں بند کر لو) اور ایک گوشے میں خاموش بیٹھ گئیں لیکن ابنِ زیاد سے تنفّر، اُس نے پوچھا مَن ھٰذِہِ المُتَنَکِّرَۃ ؟ یہ کون عورت ہے جس کی ناک بھوں چڑھی ہوئی ہے!

کسی نے کہا: زینب بنتِ علی۔ وہ ملعون بولا: "خدا کا شکر ہے جس نے تم کو رسوا کیا اور بنائی ہوئی شہرت کو جھٹلا دیا۔" زینبؑ نے جواب دیا: "خدا کا شکر ہے کہ ہم کو اُس نے اپنے نبیؐ کی وجہ سے مکرم خلائق کیا۔ فاسق و فاجر ہی رسوا ہوا کرتے ہیں اور جھٹلائے جاتے ہیں۔ یہی ہمارے دشمن ہیں۔" اُس نے پوچھا: "تمھارے نزدیک خدا نے تمھارے بھائی حسینؑ کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟" انھوں نے فرمایا: "ربُ العزت نے جو کچھ کیا اچھا کیا۔ یہ لوگ جو کربلا میں قتل ہوئے۔ خدا ہی کے حکم سے ہوئے اور سیدھے جنت میں پہنچ گئے۔ قریب ہے وہ زمانہ کہ ظالم و مظلوم دونوں اُس عادلِ حقیقی کے سامنے کھڑے ہونگے۔ اے ابنِ زیاد! تو بھی موقفِ ظلم میں کھڑا ہو گا جواب کے لیے تیار رہ۔ (اے ابنِ مرجانہ۔ تیری ماں تیرے غم میں روئے) میں بھی تیرے سامنے موجود ہونگی۔ دیکھ لینا کون کیسا ہے۔"

ابنِ زیاد نے حکمِ قتل کا ارادہ کیا۔ لیکن عمرو بن حریث موجود تھا اُس نے کہا کہ عورتوں سے مواخذہ نہیں کیا جاتا۔

جنابِ زینبؑ کا کلام کوفے میں ابنِ زیاد سے اور شام میں یزید ملعون سے عربی زبان میں فصاحت و بلاغت کا ایک نمونہ ہے جو اہلِ نظر سے پوشیدہ نہیں۔ کوفے میں تین روز قیام رہا۔

زینبؑ شام میں | جب کربلا کے قیدی دمشق پہنچے تو ان کو ایک خرابے میں رہنے کو جگہ دی گئی۔ اور صبح کو مجلسِ یزید میں پہلی مرتبہ رسن بستہ لائے گئے وہ ملعون تختِ شاہی پر بیٹھا تھا اور سرِ حسینؑ طشت میں سامنے رکھا تھا جس سے ناگفتہ بہ بے ادبی کر رہا تھا۔ چنانچہ ایک صحابیِ رسولؐ نے جو وہاں موجود تھے اسکو اس حرکت ناشائستہ سے باز رکھا (سید سجاد اور یزید کی گفتگو اور حکم قتل وغیرہ بیان خارج از بحث ہیں) جنابِ زینبؑ نے جو احتجاجات خطبے کی صورت میں دربارِ یزید میں کیے ہیں وہ اصل زبانِ عربی میں زیادہ پر لطف ہیں (کوفہ اور شام دونوں کے خطبے آخر میں اردو میں ترجمہ کر دیے گئے ہیں) اعلائے کلمۂ حق میں وہ وہ نکات اُن معظمہ نے بیان فرمائے کہ اہلِ دربار کی آنکھیں کھل گئیں اور وہ پروپیگنڈا جو دورِ معاویہ سے لیکے اُسوقت تک آلِ رسول کے خلاف شام میں کیا گیا تھا ایک دم میں باطل ہو گیا۔ جب یزید ملعون نے دیکھا کہ کلامِ زینبؑ سے عمائدِ دربار متاثر ہو رہے ہیں تو قتلِ حسینؑ پر اظہارِ ندامت کرنے لگا اور ابنِ زیاد پر الزامِ قتل رکھنے لگا۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ تم لوگوں کو اختیار ہے چاہے مکے جاؤ یا مدینے یا یہیں رہائش اختیار کرو

جنابِ زینبؑ نے فرمایا: "اے یزید! ابنِ زیاد کی سخت گیری نے ہم سوگواروں
کو شہیدوں پر دل کھول کے رونے نہیں دیا۔ سب سے پہلے ہم مجلسِ عزا
برپا کرنا چاہتے ہیں۔" اُس نے کہہ دیا ایک مقامِ وسیع دے دیا جائے۔ چنانچہ
اُس مقام پر غمِ حسینؑ برپا کیا گیا۔ لکھا ہے کوئی زنِ قریشیہ و ہاشمیہ دمشق
میں نہ تھی جو ان مجالسِ عزا میں نہ شریک ہوئی ہو اور حزن و ملال نہ کیا ہو۔
ایک ہفتے تک یہی عالم رہا۔ یزید کو یہ خوف بھی تھا کہ ایسا نہ ہو اہلِ شام
ان مظاہراتِ غم سے متاثر ہو کے غدر کر دیں۔ سیدِ سجادؑ کو بلا بھیجا۔
جنابِ زینبؑ کو جب یہ معلوم ہوا تو اُن کے پاس آئیں اور فرمایا: "اے
نورِ نظر! ذرا نرمی و انکسار سے گفتگو کرنا وہ ظالم بڑا سنگدل ہے۔ اللہ اور
اُس کے رسول سے نہیں ڈرتا" جب یہ پہنچے تو کھڑا ہو گیا اور اکرام و احترام
کے ساتھ صدرِ مجلس میں جگہ دی اور کہا: "اے علی ابن الحسینؑ! جو ضرورت ہو
کہیے۔ وہ رفع کر دی جائے۔" آپ نے فرمایا: "مجھے تو کوئی احتیاج نہیں۔
دوسرے یہ کہ میری پھوپی زینب کو ہمارے معاملات میں اختیارِ کامل ہے
اُن سے دریافت کر لے۔" چنانچہ جنابِ زینبؑ کو مع زنانِ اہلبیتؑ طلب
کیا گیا اور اُن کے اعزاز و احترام کا بے حد خیال کیا گیا۔ حتیٰ کہ دربار میں
ایک پردہ ڈال دیا گیا جس کے عقب میں اہلِ حرم تھے۔ سیدِ سجادؑ نے
قولِ یزید کو پھوپی سے دُہرایا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کے رونے لگیں۔ یزید

مولا: اے جواہر حسینؑ اب صبر کرو۔ جو ہوا سو ہوا۔ اب جو آ گئے ہیں اُن پر نظر کرو۔ چنانچہ جناب زینبؑ نے مراجعت مدینہ کی خواہش کا اظہار کیا۔ یزید نے خواہ مخواہ انتقام کا حکم صادر کر دیا۔

اختلافات در توقف شام

ارباب اطلاع نے شام میں مدّتِ قیامِ اہلبیتؑ کے متعلق اختلاف کیا ہے کوئی کہتا ہے اٹھارہ روز، کوئی کہتا ہے چالیس روز۔ اور کسی نے چھ مہینے لکھے ہیں۔

غارت شدہ چیزیں سوائے عزتِ آلِ رسولؐ کے سب واپس ملیں۔ حتیٰ کہ بقول محقق مہرِ حسینیؑ بھی سیّد سجادؑ کے حوالے کر دیا گیا تاکہ جسدِ حسینؑ سے ملحق کر دیا جائے۔

سیاہ عماریاں اور کجاوے اونٹوں پر رکھے گئے۔ نعمان بن بشیر اور ایک مختصر محافظین کی جماعت کے ساتھ یہ تباہ شدہ قافلہ منزل بمنزل ٹھہرتا ہوا دوبارہ واردِ کربلا ہوا۔ اور وہاں سے مدینے پہنچا۔ جس وقت یہ سب مدینے پہنچے تو ایک حشر بپا تھا۔ اور وہاں کا بچہ بچہ واحسیناہ کی صدا بلند کر رہا تھا۔ جناب زینبؑ یوں اپنے مشن کو آخری منزل تک بخیر و خوبی لے آئیں!

لکھا ہے کہ متواتر پندرہ روز تک اہلیانِ مدینہ نے مجلسِ عزائے حسینؑ برپا کی۔ یوں تو اگر دیکھا جائے تو جناب زینبؑ نے دمشق ہی میں مجالسِ حسینؑ کی

بُنیاد ڈالدی تھی۔ جہاں زنانِ قریش و ہاشمیہ کا کافی مجمع ہو جایا کرتا تھا
لیکن مدینے میں اُسکی دوسری نوعیت تھی یعنی یہاں مرد اور عورتیں سب
مختار تھیں کہ جس وقت اور جسطرح چاہیں مجالسِ عزا برپا کریں۔
جنابِ زینبؑ غالباً سمجھ گئی تھیں کہ سلطنت کے خلاف اگر کوئی حربہ کام
کرنیوالا ہے تو وہ ناراضیِ عوام۔ چنانچہ ان مجلسوں کی نوعیت ہی یہی قائم
کردی کہ بنی اُمیہ سے عوام میں نفرت پیدا ہو جائے۔ اور ہو گئی حتیٰ کہ بنی اُمیہ
مٹ گئے۔ مگر اُن سے نفرت اب تک باقی ہے۔

امتحانِ زینبؑ

صوفیائے کرام اور عارفانِ الٰہی کا یہ قول ہے کہ
البلاءُ للولاءِ تکمیلِ محبتِ الٰہی بغیر آزمائشِ قوائے ظاہری ممکن نہیں
اسی وجہ سے انبیاؑ اور اولیاء اللہ پر بڑے بڑے مصائب گزرے
ہیں۔ خود ہمارے رسولِ کریمؐ و اُنکے اہلبیتؑ پر صدماتِ عظیمہ گزرے
ظاہر ہیں لیکن اُنکے ساتھ یہ بھی ہے کہ جہاں اُنکے شدائد امتحانات
پر نظر پڑتی ہے پیشِ خداوندِ عالم اُنکے مراتب کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے۔
جنابِ زینبؑ عورت تھیں لیکن اکتسابِ فضائلِ روحانی میں اُنھوں نے
جوانمردانِ طریقت کے دائرے میں قدم رکھدیا ہے۔ اگر آپ اُنکی زندگی
پر نظرِ غور ڈالیے تو معلوم ہوگا کہ اُنھوں نے عالمِ انسانیت میں ہر قسم کا امتحان
دیا اور سب میں شاندار کامیابی حاصل کی۔

صبر و رضا

لکھا ہے کہ جابر بن عبداللہ انصاری بہت ضعیف ہو چکے تھے سخت
بیمار ہوئے، امام محمد باقرؑ اس محبوب صحابی رسولؐ کی عیادت کو تشریف
لیگئے، اور مزاج پرسی کی جناب جابرؓ نے کہا: "اب وہ عالم ہے کہ
بڑھاپا شباب سے زیادہ محبوب، مرض صحت سے زیادہ مرغوب اور موت
حیات سے زیادہ مسرور کرنے والی ہے۔

جناب باقرؑ مسکرائے اور فرمایا: "بھئی میں تو یہ جانتا ہوں کہ بڑھاپا ہو
یا شباب، مرض ہو یا صحت، حیات ہو یا ممات، جو کچھ اللہ عطا کرے میرا سر
اطاعت خم ہے۔" جناب جابرؓ نے جو یہ سنا تو پیشانی امام پر بوسہ دیا،
اور کہا: "رسول اللہؐ نے سچ فرمایا تھا کہ اے جابر تو میرے اس
فرزند سے ملے گا جو میرا ہمنام ہوگا اور اسکی نظر خوض زین علم میں
شگاف ڈالکے جواہرات نکال لے گی۔"

اس ذکر سے یہ نتیجہ نکالا جاتا ہے کہ جناب جابرؓ مرتبہ صبر کے حامل تھے۔
لیکن امامؑ نے مرتبہ تسلیم و رضا کی تلقین فرمائی جسکی منزل صبر سے بلند تر ہے۔

بندہ می نالد بحق از درد خویش — صد شکایت می کند از رنج خویش
حق ہمی گوید کہ آخر رنج و درد — مر ترا لابہ کنان و راست کرد
در حقیقت ہر عدو داروی تست — کیمیای نافع و دلجوی تست
زین سبب بر انبیا رنج و شکست — از ہمہ خلق جہان افزون ترست

(مثنوی شریف)

جنابِ زینبؑ کی ابتدائے غم حضرت ختمی مرتبتؐ کی وفات پھر دو ہجر جنابِ فاطمہؑ سے جدائی، اور غم پدر عالیمقام حیدر کرارؑ، حسن مجتبیٰؑ کی شہادت اسکے بعد امام حسینؑ کے دلخراش معاملات ترکِ مدینہ، رہائشِ مکہ، سفرِ کربلا، تعاقبِ حاجی خبرِ قتلِ مسلم بن عقیلؑ، مداخلت حر بن یزید ریاحی، داخلۂ کربلا، مسئلۂ نصبِ خیام امام حسینؑ اور عمر بن سعد کی گفتگو۔

انتہائے غم، قحطِ آب و غذا، بچوں کی پیاس، اعزا و انصار کی قربانی، اپنے فرزندوں کا قتل اور آخر میں وہ عظیم الشان شہادت جسکے متعلق اقبال مرحوم نے خوب کہا ہے

اللہ اللہ بائے بسم اللہ پدر معنیٔ ذبحِ عظیم آمد پسر

کمالاتِ زینبؑ کا اظہار

اب وہ موقع آگیا کہ دنیا نے خواتینِ خاندانِ رسالت کے اصلی جوہر دل کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ اسیر ہیں اور بے مددگار، مگر معاملۂ حق میں دلیر، روشن مثال چھوڑ گئیں کہ (مرد ہو یا عورت) حق کی موجودگی میں باطل یوں ٹھکرا دیا جاتا ہے۔ چاہے وہ حاکم کوفہ کی مجلس ہو یا امیر شام کا دربار، سونے پر سہاگہ یہ کہ اپنے کسی قول و فعل سے کلامِ خدا اور احکامِ رسولؐ کے اشارات کو نظر انداز نہیں کیا۔ سلام اور قلبی سلام اس خاتونِ خاندانِ رسالت پر جس نے حسینی مشن کو اپنی آخری سرحد پر پہنچا دیا اور اپنے کارناموں کو مفاخرتِ اسلام کیلئے طرۂ امتیاز دنیا کے زینتِ فردوس ہو گئیں۔

زینبؑ کا خواب

ابوہاشم جعفری نے امام علی نقیؑ کے معجزات کے ضمن میں

لکھا ہے کہ متوکل عباسی کے دورِ سلطنت میں ایک عورت نے دعویٰ کیا کہ
میں زینب بنتِ علیؑ ہوں (نور الابصار میں بھی یہی واقعہ لفظ شریفہ کے ساتھ
نقل ہے) متوکل نے اُسے بلا کے کہا کہ تو نوجوان عورت ہے اور رسولؐ
کے زمانے سے اس وقت تک مُدت دراز گزر چکی ہے تو بُڑھیا نہیں ہوئی۔ اُس نے
جواب دیا کہ میرے جد رسول اللہؐ نے میرے حق میں اللہ سے دعا کی تھی کہ
ہر چالیس سال گزرنے پر کچھ روز روپوش ہو جایا کرے بعد پھر جو نمودار ہوں تو جوان ہوں۔
لوگوں نے کہا کہ زینب بنت علی کا یہ سنِ وفات ہے۔ متوکل بولا۔ کیا جواب
دیتی ہو؟ اُس عورت نے کہا یہ درمیانی زمانہ میرے لیے روپوشی کا تھا۔ میں تو
اصلی زینب ہوں۔ کوئی شخص میرے سنِ وفات و مدفن کو صحیح نہیں بتا سکتا۔
متوکل نے کہا: "میں نسلِ عباسی سے نہیں اگر اس جھوٹی کو جھٹلا کے نہ چھوڑ دوں۔"
درباریوں نے مشورہ دیا کہ امام علی نقیؑ کو بلایئے۔ شاید یہ قضیہ حل ہو جائے
وہ تشریف لائے۔ واقعے کی اطلاع دی گئی۔ آپ نے بھی فرمایا: "بھئی
زینب بنت فاطمہؑ تو فلاں سنہ میں وفات فرما گئیں۔" متوکل نے کہا: "میں
اس دلیل سے اس مدعیہ کو خاموش نہیں کرنا چاہتا بلکہ یہ چاہتا ہوں کہ
اس کے سامنے کوئی عملی کسوٹی اہلبیت کے گوشت پوست ہونے کیلئے پیش کی جائے۔
امامؑ نے فرمایا: "اگر یہ فاطمہ زادی ہے تو اسے درندوں کے سامنے چھوڑ دیا
جائے اسے کوئی گزند نہ پہنچے گی۔" متوکل نے اُس سے پوچھا کیا کہتی ہو؟

وہ تھی بڑی طرّا اور حاضر جواب بولی: "یہ حضرت تو رشک سے چاہتے ہیں کہ مجھے درندے پھاڑ کھائیں۔" امامؑ نے بھرے دربار کی طرف نظر اُٹھا کے کہا: "اے متوکل! تیرے سامنے حسنی بھی ہیں حسینی بھی، زینبی بھی ہیں جعفری بھی، رضوی بھی ہیں کاظمی بھی خلاصہ یہ کہ آلِ رسول کا نچوڑ موجود ہے کسی ایک سے کہدے کہ خونِ فاطمہؑ کی آزمائش کرا دے!

ابو ہاشم خدا کی قسم کھا کے لکھتا ہے کہ اس قول سے مدعیانِ نجابت و شرافت کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے بھونڈا سے منہ نکل آئے۔ دل میں کہنے لگے۔ جل تو جلال تو صاحب کمال تو آئی بلا کو ٹال تو۔

بعض نے کھڑے ہو کے کہا: "اے امیر المومنین علی نقیؑ تو قائم مقام امامِ رضاؑ ہیں یہ کام تو انہیں کا ہونا چاہیے۔ چنانچہ متوکل نے حضرت کی طرف متوجہ ہو کے کہا: "آپ کو کیا عذر ہے؟ فرمایا: "کچھ نہیں حکم ہو کہ بِرکۃ السباع کے کٹہروں کے شیر چار دیواری کے اندر چھوڑ دیے جائیں اور باہر کی جانب نردبان رکھ دی جائے۔" حکم کی دیر تھی بھوکے شیر احاطے میں گشت کرنے لگے۔

ادھر سے پورا دربار اُٹھ کے درندہ خانے پہنچ گیا۔ امام نہایت اطمینان سے سیڑھی کے ذریعے سے احاطے میں اتر گئے۔ آلِ رسول کے فدائیوں میں اَیَّدَکَ اللّٰہُ بِنَصْرِہٖ کا شور اُٹھا۔ زمین پر قدم رکھنا تھا کہ تمام

شیروں نے گردنیں ڈال دیں اور امام کے چاروں طرف حلقہ باندھ لیا معلوم ہوتا تھا جیسے پالتو بکریاں ہیں۔ آپ نے سب کے سروں پر دستِ شفقت پھیرا۔ پھاٹک کی سلاخوں سے سب دیکھ رہے تھے اور انگشت بدنداں تھے۔

کہ متوکل کے وزیر نے کان میں کہا: "جلد سے جلد اس مظاہرے کو ختم کرا دیجیے ایسا نہ ہو کہ شہر میں خبر پہنچ جائے اور لوگ جوق جوق یہاں پہنچ جائیں اور اپنی آنکھوں سے شرفِ جلالتِ امام دیکھ لیں حضور میں بتائے دیتا ہوں کہ آپ کے اقتدارِ شاہی میں گھن لگ جائیگا گھن!"

چنانچہ امام سے درخواست واپسی کی گئی اور آپ نے منظور فرمائی۔

اب متوکل نے بی زینب بی سے کہا: "تشریف لائیے!" اُس بیچاری کے کاٹو تو لہو نہیں۔ گڑگڑا کے کہنے لگی: "میں فلاں کی بیٹی اور فلاں مقام کی رہنے والی ہوں۔ میں نے جھوٹا دعویٰ کیا تھا۔ ترحمِ خسروانہ سے معاف کر دی جاؤں۔"

متوکل کی آتشِ غضب بھڑک اٹھی اور حکم دیا کہ زبردستی شیروں کے سامنے ڈالدی جائے لیکن اس کے منہ سے نکل گیا: "زینب خواہرِ حسین کا صدقہ مجھے بخشدیا جائے۔"

اس پر متوکل کی بوڑھی ماں کو رحم آگیا اور اسے چھڑوا دیا۔

زینب بنت علی اپنے کردارِ بلند سے اس مرتبے پر فائز ہوئیں کہ ثانی زہرا کہلائیں۔ خواتینِ اسلام اسوۂ زینب میں کم از کم ثانیِ فضہ ہو جائیں کہ دلدادہ ہو جائیں اور حضرات نقوی تو اجداد شناسی اور خود شناسی کا حق رکھتے ہی ہیں!

وفات و مدفن جنابِ زینبؑ

یہ تو دیکھیے کہ جنابِ زینبؑ جنکی ذات کو واقعۂ کربلا کے ساتھ غیر معمولی اہمیت دیجاتی ہے جنکے حالات منبروں پر بیان کیے جاتے ہیں اور جنکے سوانح لکھے جاتے ہیں اُن کا سنِ ولادت و وفات و مدفن صحیح نہیں ملتے۔

وہ تو کہیے امام حسینؑ کا واقعۂ شہادت ایک ایسا عظیم الشان واقعہ ہے جو صدیوں کے تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچا ہے۔ ورنہ بہت ممکن تھا کہ میرزا حیرت دہلوی (جس نے انکار واقعۂ شہادت کیا تھا) کامیاب ہوجاتا اور مسلمان خالی ہاتھ ملتے رہجاتے۔ بہرنہج ایک زینبِ کبریٰ کے سنِ وفات و مدفن کا ذکر کرنا ہے لہٰذا کسی ایک قول کی متابعت ضروری ہے۔

اتفاق اس پر ہے کہ وقتِ وفات جنابِ زینبؑ کی عمر ۵۵ یا ۵۶ برس کی تھی۔ شام سے جب مدینے واپس آئیں تو اسکے چھ ماہ بعد انتقال فرمایا اور مدینے میں مدفون ہوئیں۔ حضرت ناصر الملۃ بھی اسی کے موید تھے۔

راہِ شام میں بھی ایک مزار جنابِ زینبؑ ملتا ہے۔ وہ اس سلسلے میں کہ یزید نے اُن کو دوبارہ شام میں طلب کیا تھا تشریف لیجا رہی تھیں کہ ایک باغ کے قریب محمل سے اُتریں اور آبِ جاری کے کنارے بیٹھ گئیں۔ پانی کو دیکھ کے حسینؑ کی پیاس یاد آگئی۔ بیہوش ہو کے پانی میں گر پڑیں چونکہ پانی ٹھہر گیا تھا اس وجہ سے باغبان آیا اور اس نے دیکھا کہ کوئی

ٹنٹے پانی کی روانی میں حارج ہے لہٰذا ذلیخہ مارا جو سرِ اقدس پر پڑا بعد کو معلوم ہوا کہ وہ محترمہ تھیں جو شہید ہو گئیں۔ یہ روایت سقد ضعیف اور درایت سے خارج ہے کہ کوئی صحیح الدماغ انسان تو اسے باور نہیں کر سکتا۔

اسی طرح مصر میں بمقام قناطر السباع قریب مسجد جناب زینبؑ کا مزارِ مقدس بتایا جاتا ہے وہ اس سے بھی زیادہ بے بنیاد معلوم ہوتا ہے، کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ وہ روضۂ رسول و فاطمہؑ اور بقیہ نفوسِ اہلبیت کو چھوڑ کے مصر تشریف لیجاتیں اور کیوں؟ حالانکہ جناب عبداللہ بن جعفر اُن کے شوہر مدینے میں رہے اور وہیں شہر میں اُن کا انتقال ہوا۔ اولادِ جناب زینبؑ بنت علیؑ میں سے ممکن ہے اس نام کی کوئی بی بی وہاں دفن ہوں اور حولِ زمانہ نے وادی اور ہوتی میں اشتباہ پیدا کر دیا ہو۔ بہر حال بعض علما کا یہ خیال ہے کہ جہاں کہیں اُن محترمۂ معصومہ کا مدفن مقرر ہو اُسے قابلِ احترام سمجھنا چاہیے۔

ترجمہ خطبہ کوفہ (محفلِ ابن زیاد)

اے اہلِ کوفہ! اے غدار و مکار لوگو! تم ہم پر گریہ کرتے ہو حالانکہ خود تم نے ہم کو ذلیل کیا ہے! سو وقت تک تمہارے ظلم و ستم سے ہمارے آنسو

نہیں تھے اور نہ ہونے والے نہیں ہوں گے۔ تمہاری مثال اُس عورت کی ہے جس نے اپنے رشتے کو
مضبوط بٹا اور پھر کھول ڈالا۔ اسی طرح تم نے اپنے رشتۂ ایمان کو توڑ کے کفر کی طرف
عود کیا۔ تمہارا دعویٰ سراسر بے اصل اور یکلخت باطل ہے۔ جیسے کنیزوں کا تملق
اور دشمنوں کی عیب جوئی۔ تم لوگوں کی ایسی مثال ہے جیسے گھُورے پر گھاس
اُگی ہو۔ یا تابوتِ گور پر آرائشِ نقرہ کاری کی گئی ہو۔ تم نے آخرت میں اپنے لیے
بہت خراب توشہ اور ذخیرہ بھیجا اور اپنے آپ کو ابدالآباد تک سزاوارِ جہنم کیا۔
تم ہم پر روتے ہو۔ حالانکہ خود تم نے ہم کو قتل کیا۔ یہ سچ ہے کہ اب تم روؤ زیادہ
اور ہنسو کم۔ تم نے عیب و عارِ ابدی خود مول لیا۔ اس عار کا دھبہ تمہارے جامے
سے کسی پانی سے دھل نہیں سکتا۔ حسینؑ جگر گوشۂ رسول الثقلینؐ و سردارِ جوانانِ
بہشت کے قتل کا کس چیز سے تدارک کر سکتے ہو۔ تم نے اُس شخص کو قتل کیا جو تمہارے
پیشواؤں کا جائے پناہ اور تمہاری حجتوں کا روشن کرنے والا تھا۔
ہر مصیبت میں تم اُس سے پناہ کے طالب ہوتے تھے اور احکامِ
دین و شریعت کو تم اُسی سے اخذ کرتے تھے۔ اے کوفیو! تم نے وہ
گناہ کیا جس کے سبب سے رحمتِ خداوندی سے ناامید ہو جاؤ۔ تم
دُنیا و آخرت میں گنہگار ہو گئے مستحقِ عذابِ الٰہی ہوئے اور اپنے لیے ذلت
و خسران مول لے لیا۔ تمہارے ہاتھ قطع ہو جائیں اے اہلِ کوفہ! وائے ہو
تم پر۔ سوچو تو تم نے رسولؐ کے کن جگر پاروں کو قتل کیا۔ دیکھو کن پردگیان

اہلبیتِ رسول کو بے پردہ کیا۔ تم نے ایسے افعالِ بد کیے ہیں جن کی تاریکیوں نے
زمین و آسمان کو گھیر لیا۔ تم کو تعجب ہے کہ آسمان سے خون برسا۔ یہ
کیوں؟ عذابِ آخرت کے وقت تم پر ظاہر ہو جائے گا۔ اور اس سے بدتر
جہاں تمہاری کوئی مدد نہ کرے گا۔ اس مہلت سے مغرور نہ ہو۔ کیونکہ حق تعالیٰ
عاصیوں پر عقوبت کرنے میں جلدی نہیں کرتا۔ وہ اس سے نہیں ڈرتا
کہ وقتِ انتقام گزر جاتا ہے۔ تمہارا پروردگار گنہگاروں کی گھات
میں ہے۔

ترجمہ خطبہ شام
(دربارِ یزید)

بعدِ حمدِ خدائے برتر و نعتِ جدِّ پیغمبر۔ جن لوگوں نے بدی کی اُس کا
انجام بد ہوگا (یعنی وہ لوگ جنھوں نے آیاتِ خدا کو جھٹلایا اور اُنکی
ہنسی اُڑائی)۔

اے یزید! کیا تیرا یہ گمان تھا کہ ہم پر تمام راہیں بند کر کے
ہم کو قید کرکے اور کوچہ بازار میں پھرا کے تو کوئی فوقیت حاصل
کرلے گا۔ کیا تو یہ سمجھا ہے کہ اللہ کی طرف سے ہمیں ذلت ملی ہے
اور تجھے بخشش و رحمت۔ تو اس کو اپنے لیے بڑی عظمت و شان
سمجھتا ہے۔ تیرا دماغ آسمان پر پہنچ گیا ہے اور تو خوشی کے مارے

بغلیں بجا رہا ہے (اور تو یہ سمجھ گیا ہے) کہ ہمارا ملک تیرے
لیے صاف ہو گیا ہے۔ اور ہمارا اقتدار تیرے حصے میں آ گیا
ہے۔ ذرا تعقل سے کام لے۔ کیا تو حکم خداوندی بھول گیا کہ فرماتا
ہے: "جن لوگوں نے نافرمانی کی ہے وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ ہم نے انکو
چھوڑ دیا۔ بلکہ ان کی رسی دراز کر دی ہے تاکہ اور عصیان کریں۔
حقیقت یہ ہے کہ ان کے لیے سخت عذاب ہے"۔ اے یزید! یہ
کیا انصاف ہے کہ تیری عورتیں پردے میں رہیں اور زنان آل رسول
کی بے حرمتی کیجائے۔ ان کو شہر بشہر کوچہ و بازار میں بے مقنع و چادر
پھرایا جائے۔ تو نے ہر طبقے کے انسانوں میں ان کی پردہ دری کی۔ انکے
ساتھ کوئی حامی و مددگار نہ تھا۔ ظاہر ہے کہ تو نے خدا کی نافرمانی
اور رسالت کا انکار کیا۔ تجھ ایسے کافر سے ان حرکات کا سرزد ہونا
کچھ بعید نہیں ہے۔ ایسے ظالم سے کیا امید مہر و مہربانی ہو سکتی ہے
جس کے موہنہ سے شہیدوں کے جگر دکھائی دیں (اشارہ سوئے ہندہ جگر
خوارہ) اور جو اخیار امت کی خونریزی کر کے بھول گیا ہو جس نے
خلاف رسول لشکر کشی اور جنگ کی ہو اور رسول کے سامنے
تیغ اٹھائی ہو سخت کافر ہے وہ عرب جو خدا کا منکر ہو۔ اور اس سے بھی
زیادہ وہ جو اس کے رسول سے طاغی ہو۔ خلاصہ یہ کہ وہ ظلم کھلا

کافر ہے جس نے کفر و طغیان ظلم و عدوان اختیار کیا۔ یہ سب علامات کفر ہیں
اور بتاتے ہیں کہ غزوہ بدر کے مقتولین کا کینہ اب تک سینے میں باقی ہے۔ ہم اہلبیت سے
وہی بغض رکھے گا جس کی نظر میں عقیدہ عداوت و کینہ جاگزیں ہوا اور کفرانِ
رسالت کھُلم کھُلا کرتا ہو جس نے اُس کے فرزند کو قتل کیا ہو اور اُس کی
ذریت کو اسیر۔ جو اس فعل بد کو نہ عظیم تصور کرے اور نہ توبہ کرے بلکہ ایسی
دیدہ دلیری کرے کہ مقتولین بدر کو پکار کے یہ شعر پڑھے:

لاھلّوا واستھلّوا فرحاً ویقالوا یا یزیدُ لا تشلّ!

(اے کاش میرے وہ بزرگ جو جنگِ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے تھے آج موجود ہوتے
اور دیکھتے کہ میں نے رسولؐ کی اولاد سے کیا بدلا لیا۔ تو بہت خوش ہوتے اور کہتے
کہ اے یزید تیرا ہاتھ نہ شل ہو (قتل کیے جا)

جن دُرہائے دنداں پر رسولؐ نے بوسے دیے ہوں اُن کو چوب سے چھیڑا گیا ہو
اور غضب یہ ہے کہ اس فعل سے آثارِ فرح چہرے پر ہوں۔ میں بقسم کہتی ہوں
کہ تو نے زخم کو کرید دیا اور رسالت کی بیخ کنی کرنی چاہی! اور پھر تو نے
حسینؑ شبابِ اہلِ جنت اور لختِ جگر حیدرِ کرار کا خون بہا کے اپنے اسلاف کو
یہ کہہ کے پکارا: لیتَ اشیاخی ببدرٍ شھدوا (کاش ہمارے جنگِ بدر
کے مقتولین دیکھتے)
اگر وہ نہ آئے تو خود تو اُن تک جلد پہنچے گا اور جب اُن کا اور تیرا آمنا سامنا

ہوگا تو تجھے پتہ چلے گا کہ تو اور وہ کس سخت عذاب الٰہی میں مبتلا ہوئے۔ اس وقت تو چاہے گا کہ کاش وہ ہاتھ جس کا شل ہونا تو نہ چاہتا تھا کہنی سے قطع ہوجاتا اور کہتا کہ بہتر تھا میں پیدا ہی نہ ہوا ہوتا۔ تاکہ اس غضب الٰہی و خشم رسول سے دوچار ہونا نہ پڑتا۔

بارِ الٰہا! ہمارے ظالموں سے بدلہ لیلے اور ہمارے قاتلوں پر غضب نازل کر جنھوں نے بےوالی وارث کرکے ہماری ہتک حرمت کی۔ خیر۔ اے یزید۔ جو تونے کیا سو کیا۔ مگر تونے اپنا ہی پوست جدا کیا اور اپنا ہی گوشت قطع کیا۔ وہ وقت قریب ہے کہ تجھے رسول کے سامنے اُن افعال کی جوابدہی کیلیے جانا پڑیگا جو تونے اُن کے لیے جائز رکھے (اُن کی آل کی خونریزی اور ہتکِ حرمت) اُس وقت جبکہ عادلِ برحق اُنکے گروہ کو یکجا کریگا اُنکے اعدا سے انتقام لیگا اور اُنکے حق کا مواخذہ کرے گا۔ اُس وقت اس خونریزی سے تجھے خوشی نہ ہوگی۔ یقین رکھ کہ شہدا زندہ ہیں۔

اے یزید! تیرے تھرا جانے کے لیے یہ اطلاع کافی ہے کہ میدانِ عدل میں عادلِ حقیقی کے سامنے اُس کا رسول مدعی ہوگا اور جبرئیل (حسینؑ کا جھولا جھلانے والا) اُس کا مددگار ہوگا۔ خدا ظالموں کو بہت برا بدلہ دیگا۔ اُس وقت تجھے معلوم ہوگا کہ کون گیا ہے؟

اگر گردشِ زمانہ سے اس وقت ہم تیرے سامنے اس حال سے موجود ہیں لیکن ہماری نظر میں تیری ذرا بھی وقعت نہیں بلکہ توبیخ پر زیادہ نظر ہے۔ دیکھ! اس حادثۂ عظیمہ سے مسلمانوں کی آنکھیں رو رہی ہیں اور

اُس کے ذکر سے قلوب تپ رہے ہیں۔ سخت دل اور گمراہ نفوس ہی ایسے مقامات
ہیں جہاں عذابِ الٰہی اور لعنتِ رسول نازل ہوتی ہے۔ ان سب کے دلوں میں
شیطان جاگزیں تھا اور اپنا کام کر کے چلا گیا۔ تعجب یہ ہے کہ عترتِ اطہار
جو نسلِ انبیاء اور تسبیح سے ہیں ایسے خبیث طینت گروہ کے ہاتھ سے قتل ہوں!!
اُن کے ہاتھ ہمارے پاک خون سے آلودہ ہیں۔ اور اُن کے دہانِ نجس نے ہمارا
گوشت چبایا ہے۔ زیادہ تعجب یہ ہے کہ ایسے اجسام پاک (لاشے) صحرا میں
بے دفن و کفن پڑے ہوں اور ان کے گرد مردہ خوار جانور لگے ہوں۔
اے یزید! اس وقت تو نے ہم کو لوٹا۔ قیامت آنے دے۔ دیکھنا کس قدر
جلد ہم تجھ سے انتقام کے لیے آگے بڑھتے ہیں۔ تیرے لیے اُس وقت کوئی چارہ
نہ ہوگا سوائے اس کے جو کر چکا ہے اُس کا خمیازہ بھگتے۔ اللہ بڑا منصف ہے
اور وہی داد خواہوں کا ملجا و ماوی ہے۔
جو مکر جی چاہے اس وقت کھیل لے اور اپنی سعی کر لے۔ جو شرف خدا و رسول سے
ہمیں ملا ہے اُس تک تو نہیں پہنچ سکتا۔ ہمارا ذکر ابد الآباد تک رہے گا اور
ان افعالِ قبیحہ کا دھبہ تیرے دامن سے کبھی نہ مٹے گا۔ اے سخت عقل تیرے
دن گنتی کے رہ گئے ہیں تیرا گروہ پراگندہ ہو جائے گا اور تیرا سب ٹھاٹھ بگڑ کے
رہ جائے گا۔

(اہل بیتِ رسالت پر صلوٰۃ و سلام)

کتبہ مرصع رقم رامپوری